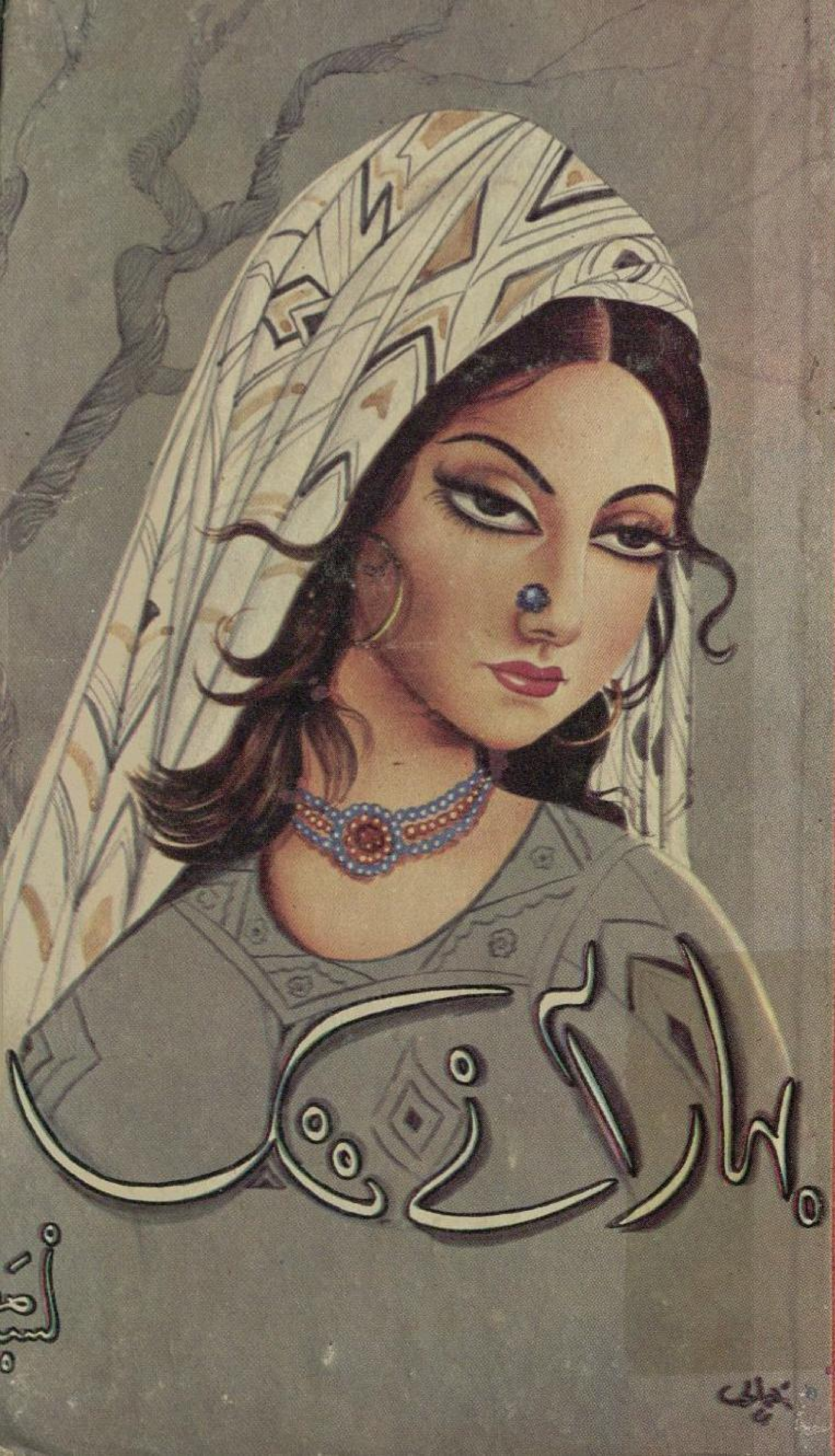

بہار آنے تک

بہار آنے تک

نسیمہ مظہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور • حیدرآباد • کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پبلشرز ۔ لاہور

قیمت : روپے

Rs. 15/-

مقام اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز ۔ پبلشرز
ادبی مارکیٹ ۔ چوک انار کلی ۔ لاہور

نذر قارئین ـــــــ!

آج میرا دوسرا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
میرا پہلا ناول "منزہ" ۱۹۶۹ء کے اختتام پر منظر عام پر آیا تھا۔
خوش قسمتی سے "منزہ" کی تخلیق اور طباعت و اشاعت کا درمیانی وقفہ بہت ہی مختصر تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ناول مجھ سے میرے پبلشر عرفان صاحب نے مکمل کروایا تھا۔
عرفان صاحب کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی رو سے ہر باب مکمل ہوتے ہی کتابت کے لیے دیدیا جاتا تھا۔ کئی مواقع تو ایسے بھی آئے جب میری دوسری مصروفیات کی وجہ سے لکھنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو کاتب کو اگلا باب جلد مکمل کرنے کے لیے تقاضا کرنا پڑا۔ اس کے برعکس "بہار آنے تک" کے ذہن سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے اور اس کے بعد اشاعت کے مرحلوں سے گزر کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنے تک تقریباً چار پانچ سال کی ایک طویل اور صبر آزما مدت حائل ہے۔
"بہار آنے تک" کا خاکہ "منزہ" کی اشاعت کے کچھ عرصہ

بعد ہی مکمل ہو چکا تھا۔ دراصل ایک فلم ڈائریکٹر نے اپنی فلم کے لیے ایک "اچھی سی کہانی" لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ کہانی مکمل ہونے کے بعد ان کا مطالبہ تھا کہ مجھے ایک "مناسب رقم" ادا کر کے وہ یہ کہانی اپنے نام سے فلمائیں گے۔

"کیوں —؟"

"کمرشل پوائنٹ آف ویو سے مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔"

بہرحال اپنی مصلحتیں تو وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں لیکن اپنی اس ذہنی کاوش کو کسی اور کے نام سے منسوب ہو کر پردہ' سکرین پر دیکھنا——میں ان کی یہ آفر قبول نہ کر سکی کہ اصول کی بنیاد پر روپیہ یا کوئی اور لالچ کبھی میری کمزوری نہیں بن سکا۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء شروع ہوا اور پھر سقوط ڈھاکہ—!!! سقوط مشرقی پاکستان کے المیے سے پیدا ہونے والے تجارتی اور صنعتی بحران کے باعث کاغذ کی گرانی و نایابی اور اس کے چند ماہ بعد ذاتی الجھنوں اور پریشانیوں کا ایک طویل سلسلہ دونوں ناول کی تکمیل و اشاعت کی راہ میں حائل رہے غم دوراں نے سوچنے کی مہلت تک نہ دی اور یوں ۱۹۷۴ء اختتام کو پہنچا۔

دسمبر ۱۹۷۴ء میں قدرے فرصت نصیب ہوئی تو چار سال کے طویل عرصے کے بعد ناول کا مسودہ نکالا، نظرثانی اور ترمیم و تنسیخ کے بعد نوک، پلک سے سنورا اور پبلشر کے

حوالے کر دیا۔

مجھے اعتراف ہے کہ "بہار آنے تک" میرے پہلے ناول "منزہ" سے بہت مختلف ہے۔ پلاٹ اور تھیم دونوں کے لحاظ سے۔!!

میں کچھ اور لکھنا چاہتی ہوں.... اس سے مختلف..... اس سے بہتر۔ اس سے کہیں زیادہ ٹھوس اور زندہ رہنے والی چیز... جو میرے ذہن کے دور دراز گوشوں میں... کہیں بہت دور میرے تحت الشعور میں ایک ہلچل سی مچائے ہوئے ہے اور کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے لیے کسی مناسب موقع و محل کی منتظر ——!!

"بہار آنے تک" کے عیوب و محاسن کے متعلق میں کچھ نہیں کہونگی کہ تخلیق کے کرب سے گزرنے والے فنکار.... اور اس کے فن کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے والے بے رحم نقاد دونوں کا رول اور مقام مختلف ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔

تو قارئین ——!

آپ کی پسند و ناپسند، آپ کی رہنمائی اور آپ کی تنقید میرے ادبی مستقبل کے لیے بے حد اہمیت و افادیت رکھتی ہے۔

میری تخلیق ناول کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ پڑھیے اور جی بھر کر تنقید کے تیر و نشتر چلا لیے۔ میں ایسے

تمام وار بڑی خود اعتمادی اور کشادہ دلی کے ساتھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔!!

نسیمہ مظہر
۲ مین گلبرگ۔ لاہور

پہلا باب

سرما کی اس طویل، تاریک اور سرد رات میں ہر طرف سناٹا تھا اور ایک پراسرار سی خاموشی ——— !! پہاڑ کی چوٹی پر ایستادہ ریسٹ ہاؤس کے پاس سے گذرنے والی چھوٹی سی بل کھاتی ہوئی سڑک کا سکوت چیڑ، چنار اور یوکلپٹس کے لمبے لمبے درختوں کی سرسراہٹ یا کبھی کبھار گرجنے والے بادلوں کے شور سے چند لمحوں کے لئے ٹوٹتا اور پھر وہی پر اسرار سی خاموشی چھا جاتی ——— ——— ریسٹ ہاؤس کے کشادہ کمرے کے آتشدان میں جلنے والی لکڑیاں چیخ کر ٹوٹیں ——— چند چنگاریاں اُڑ کر سامنے پھیلے ہوئے کاغذات تک پہنچیں تو ٹیبل لیمپ کی روشنی میں لکھنے میں مصروف نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی حسین ساحرہ نے ایک لمحے کے لئے پلکوں کی جھالر اوپر اٹھائی ——— آگ کے لہراتے لپکتے شعلوں کو ایک ادائے بے نیازی سے دیکھا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

اس کا قلم رک گیا۔

وہ کچھ سوچ رہی تھی ——— دماغ پر زور دے کر ———!!

اس نے قریب پڑی ہوئی ڈائری اٹھائی ——— ورق الٹ پلٹ کر کچھ پوائنٹس دیکھے اور پھر اس کا قلم کاغذ پر بڑی روانی سے چلنے لگا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔

وہ لکھتی رہی ___

"اوہ -"! اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔ ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ وہ غور سے سننے لگی۔

اس ویران اور سنسان رات کے سناٹے میں پہاڑوں اور وادیوں میں گونجتی ہوئی مترنم اور سوز بھری آواز بڑی واضح تھی ___

"اوہو۔! بارہ بج رہے ہیں ___ ؟؟" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی نازک سی سنہری رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور ایک ادھوری سی انگڑائی لیکر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پہاڑوں اور وادیوں میں گونجتی ہوئی پر سوز مردانہ آواز قریب آتی گئی ___

اور قریب ______ قریب تر ___!!

لڑکی کی شفاف جلد کے نیچے اضطراب اور بے چینی کی لہریں بڑی نمایاں تھیں۔ گانے کے الفاظ واضح ہوتے گئے ______!! آہستہ .. آہستہ ___!

کسی انوکھی اور انجانی کشش سے مجبور ہو کر وہ آگے بڑھی ______ ٹیبل لیمپ آف کیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ______ کھڑکی کے نیچے کے پٹ بند اور اوپر کے کھلے تھے ۔

لڑکی نے پردہ ہٹایا اور باہر جھانکنے لگی ___

دور . . . . . . سڑک کے اس پار . . . . بجلی کے ایک کھمبے پر ٹمٹماتے ہوئے بلب کی روشنی میں وہ ایک ہیولا سا نظر آرہا تھا ______ چند لمحے اور گذر گئے ______ سایہ قریب آگیا ___!

وہ ایک لمبا تڑنگا سا مرد تھا ______ پینٹ ، چسٹر اور فلیٹ ہیٹ پہنے ہوئے

چسٹر کے کالر کانوں تک اٹھائے وہ بڑے بڑے پنے تلے قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا۔
آس پاس سے بے نیاز ——— اپنی ہی دھن میں مگن —!!
گانے کی آواز اسکی رفتار کے ساتھ کبھی اونچی اور کبھی مدھم ہوتی ہوئی بتدریج دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔

لڑکی کی دلچسپی اور تجسس کچھ اور بھی بڑھ گیا ——— وہ اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی ——— شوق بھری نگاہوں کے ساتھ —!!
وہ سائے میں تبدیل ہو گیا ـــ
اور پھر . . . . یہ سایہ بھی اونچی نیچی گھاٹیوں میں گم ہو گیا ——— !
وہ کھڑکی کے پٹ بند کرتی ہوئی آکر اپنے بستر پر بیٹھ گئی ـــ
"یہ ملک اور یہاں کے باشندے بھی خوب ہیں ———" اس نے زیر لب جیسے اپنے آپ سے کہا اور بستر پر لیٹ کر دونوں کمبل سینے تک کھینچ لئے ۔
دیر تک اسے نیند نہ آئی ——— وہ سوچ رہی تھی ——— اس نوجوان کیمتعلق جو اس کے لئے بالکل غیر تھا ——— اجنبی دیس کا پراسرار اجنبی ———!!
جس کے نقوش اور خط و خال تک اس پر واضح نہ تھے ——— جو اسکے لئے ایک معمہ تھا ——— ایک سربستہ راز ———!!
اور گذشتہ تین راتوں سے وہ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔
اس راز کی تہہ تک پہنچنے کو بیتاب تھی . . . . مگر تانے بانے تھے کہ الجھتے ہی چلے جا رہے تھے ——— کہیں سے کوئی سرا ملتا ہی نہ تھا . . . . . اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں لڑکی کا اپنا ذہن بھی الجھتا جا رہا تھا ۔!

"بابا۔ ! یہ نوجوان کون ہے جو ہر روز آدھی رات کو یہاں سے گاتا ہوا گزرتا ہے ۔۔۔؟"
صبح ناشتے کی میز پر گذشتہ دو تین دن سے ذہن میں کلبلانے والا سوال خود بخود کرسٹا کی زبان پر آگیا۔
چوکیدار خاموش تھا ۔۔۔۔۔ کرسٹا کے سوال کو سنا ان سنا کر کے وہ برتن میز پر رکھتا اور اٹھاتا رہا ۔۔۔۔۔ ہاں ایک لمحے کے لئے اس نے لڑکیوں کی طرف گہری گہری نگاہوں سے دیکھا ضرور تھا۔
"یہاں کا رہنے والا تو معلوم نہیں ہوتا ۔۔۔۔۔ اس کی چال ڈھال اور لباس یہاں کے مقامی باشندوں سے بہت مختلف ہے ۔۔۔؟" چوکیدار کی خاموشی پر وہ خود ہی دوبارہ بولی۔
"اللہ جانے میم صیب جی ۔۔۔ ام بڑے دنوں سے یہ آواز سنتی ہے ۔ ہر روز رات کے بارہ بجے یہ آدمی کا بچہ ادھر سے گاتا بجاتا گزرتی ہے، پر وہ کدھر سے آتی ہے کدھر کو جاتی ہے امارے کو کچ نائیں مالوم ۔۔۔۔۔ اللہ کے بھید اللہ جانتی ہے پر لوگ کہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا خیر ۔۔۔۔۔ !؟"
پہاڑی چوکیدار کو اردو بولنے میں کافی دقت پیش آتی تھی مگر وہ جیسے تیسے اپنا مطلب بیان کر ہی لیا کرتا تھا۔
"ہاں ہاں رک کیوں گئے ۔۔۔۔؟" کرسٹا نے سوال کیا لیکن چوکیدار نے پھر چپ

سادھ لی تھی ــــــ ایک لمبی خاموشی ــ!!
چوکیدار کے پراسرار لہجے اور نامکمل بیان کی وضاحت کی خاطر کرسٹا اور ہیلن نے ادل بدل کر اپنے سوالات دہرائے ــــــ طرح طرح سے اسے کریدنے کی کوشش کی مگر وہ مزید زبان کھولنے پہ آمادہ نہ ہوا ــــــ پتہ نہیں کیوں ــ!!
دن گذرا ــــ شام ہوئی اور پھر رات بھی آگئی ــــــ کرسٹا آج پھر منتظر تھی، اس اجنبی آواز کی ــــــ !! رات بھیگ چلی تھی ۔ وقت گذرتا جا رہا تھا ــــــ ٹھیک بارہ بجے مخصوص نغمے کی آواز آئی ــ!

وہی دھن ــ!

وہی بول ــ!

اور وہی درد میں ڈوبی ہوئی آواز ــ!!

حسب معمول وہ کھڑکی میں کھڑی تھی ــــــ نگاہوں میں تجسس کی چمک لئے پردہ ہٹائے باہر جھانک رہی تھی ــ
وہ گذر گیا ــــــ اپنے مخصوص اور پر وقار انداز میں ــــ!!
اور جب اسکے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد کرسٹا کھڑکی سے پیچھے ہٹی تو غیر شعوری طور پر وہ بھی وہی دھن گنگنا رہی تھی ــ
"ہیلن ـــ! وہ کون ہے ــ ؟ کیا ہے ــــ ؟ کہاں سے آتا اور کہاں جاتا ہے ــ؟؟"
روز کی طرح آج پھر وہ اپنے جذبۂ تجسس کی تسکین کے لئے ساتھ والے پلنگ پہ لیٹی ہیلن سے سوال پر سوال کئے جا رہی تھی ــ
"ام کو مالوم ناہیں ــــــ وریچ کا پیپل ہی بتا نے سکتا ــــــ!!" ہیلن نے

گورا شاہی اردو کے ساتھ بے پروائی سے گردن کو خم دیا۔

"میرے خیال میں اس چوکیدار کو سب کچھ معلوم ہے لیکن کسی مصلحت، ڈر یا خوف کی وجہ سے وہ بتانا نہیں چاہتا ——" کرسٹا نے اپنے بستر کی شکنیں درست کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

"یس۔! اس کا ایٹی چیوڈ (Attitude) بڑا سٹرینج —— بیسٹرڈ سے ام پوچا بٹ نو آنسر —— ایک دم ڈیف کی مافک ——!"

ہیلن نے جسم کے گرد کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

"لیکن . . . . . اس کے گیتوں میں دل کی انتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے والا درد کیوں ہے ——؟ اسے کیا دکھ ہے ——؟ کیا غم ہے ——؟؟؟

کاش میں اس کا غم بٹا سکتی ——!" کرسٹا نے ہیلن کی بات ان سنی کر کے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

اس کے لہجے میں پریشانی تھی اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی ——!!

یورپ کی رنگین فضاؤں کی پروردہ، رومان پرور طبیعت کی مالک یہ مہم جو جرنلسٹ لڑکی ضرورت سے کچھ زیادہ نہیں بلکہ بہت زیادہ حساس تھی۔

اب تم چھوڑ دو —— ہوگا کوئی پوئر مین —— !! او۔کے ڈیئر، اب ام سلیپ مانگتا —— تم بھی سوتا ——!!" ہیلن جمائیوں پر جمائیاں لئے جا رہی تھی مگر کرسٹا کے سوالات تو ختم ہی نہیں ہوتے تھے —— وہ اس موضوع پر اظہار خیال کر رہی تھی۔

خود ہی سوال کرتی اور خود ہی ممکنہ جواب بھی دیدیتی۔

"ڈونٹ وری ڈارلنگ ـــــ! یہ لینڈ عربین نائٹ کا ہے ـــــ سٹرینج پیپل سٹرینج سٹوریز ـــ. Every thing is possible here
ٹم بے فضول انرجی ولیسٹ کرٹا ـــــ اچا گڈ نائٹ ـــــ اب ہم سونا مانگٹا ـــــ؟" اور ہیلن نے کمبل کھینچ کر منہ پر لے لیا ـــــ وہ کروٹ بدل کر یہ خاموش اعلان کر چکی تھی کہ اب وہ اس مسئلے پر مزید بات چیت کے موڈ میں قطعی نہیں اور کرسٹا . . . وہ اپنی دوست کے اس موڈ کو خوب سمجھتی تھی ۔

بہت دنوں کے بعد آج کی صبح کچھ نکھری نکھری، دھلی دھلائی اور اجلی اجلی سی تھی ـــــ سربفلک پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر سنہری کرنوں کی پریاں آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھیں ـــــ کئی دنوں کے بعد آج سورج نے دھند اور بادلوں کا دبیز نقاب اٹھا کر باہر جھانکا تھا اور اس وقت اس کی تیز کرنوں کی حدت سے درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر لٹکتے ہوئے برف کے سفید پھول پگھل پگھل کر نیچے گر رہے تھے ۔

ناشتے سے فارغ ہو کر کرسٹا اور ہیلن آنکھوں پر گاگلز چڑھائے، دوربینیں، تھرماس اور کیمرے کندھوں سے لٹکائے آس پاس کی آبادیوں میں گھومنے پھرنے کے لئے نکل گئیں ـــــ برفانی موسم کے یہ انداز ان کے لئے کچھ نئے تو نہ تھے ۔

وہ ہمیشہ سے اسکی عادی تھیں۔!

کرسٹا ولیسٹ جرمنی سے چھپنے والے ایک مشہور و معروف روزنامے کی لیڈی ایڈیٹر تھی اور ہیلن اس اخبار کی فوٹوگرافر ——— !!

یہ اخبار بیک وقت انگریزی اور جرمن دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا ——— اسکے علاوہ خواتین اور بچوں کے لئے دو ہفت روزہ میگزین بھی اس انتظامیہ کی زیر نگرانی جاری تھے۔

مقامی جرنلسٹوں میں کرسٹا اور ہیلن ایک نمایاں مقام کی مالک تھیں خصوصاً کرسٹا کے لکھنے کا سٹائل عام ڈگر سے ہٹ کر بالکل منفرد انداز لئے ہوئے تھا۔

مزاج کے لحاظ سے بھی وہ خطرات میں بے خطر کود جانے والی ایک مہم جو لڑکی تھی۔ ہیلن اور کرسٹا دونوں میں یہی ایک بات کامن تھی کہ دونوں نڈر اور مہم جو ہونے کے علاوہ سیر و سیاحت کی بھی بے حد دلدادہ تھیں ——— کافی بحث و مباحثے کے بعد اپنے اخبار کے مینیجنگ ایڈیٹر کو انہوں نے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ اپنے قارئین کو دلچسپ اور کچھ نیا مواد پڑھنے کو دینے کے لئے وہ انہیں اخبار کے خرچ پر ایشیائی ممالک کے ٹور پر بھیج دے اور ——— اب . . . . ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے مشرقی تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرتی، نگر نگر، ملک ملک اور جگہ جگہ کی سیر کرتی ہوئی وہ پاکستان کے دور افتادہ علاقے میں آنکلی تھیں اور گذشتہ کئی روز سے پہاڑ کی چوٹی پر اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہاں رکنے پر مجبور تھیں کہ موسم سرما کی شدید برف باری کے باعث اس وادی میں آمد و رفت کے راستے بالکل بند ہو چکے تھے۔

ظالم موسم کی شدت سے بے نیاز دن بھر وہ آس پاس کی آبادیوں میں گھومتیں پھرتیں۔ پہاڑوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے گھروندہ نما مکانوں کے سادہ دل مکینوں، کسانوں اور چرواہوں سے ملتیں —— ان کے کلچر اور روزمرہ زندگی کی دلچسپیوں کا مشاہدہ کرتیں —— ان سے انٹرویو لیتیں —— ان کی رسومات وروایات کے متعلق معلومات حاصل کرتیں۔ ان کی تصویریں بناتیں اور پھر کرسٹا ایک خوبصورت سا فیچر تیار کر کے ان تصاویر کے ساتھ اپنے اخبار کے خاص ایڈیشن کے لئے بھجوا دیتی۔ اپنے دورے کے تاثرات اور تجربات و مشاہدات پر مشتمل وہ ایک سفرنامہ بھی مرتب کر رہی تھی —— اس سفرنامے کی چند قسطیں اس کے اخبار میں شائع ہو کر زندہ دل جرمن عوام سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھیں اور اب اخبار کے قارئین اس قسم کی مزید دلچسپ قسطوں کا تقاضا کر رہے تھے —— اخبار کی اشاعت میں اضافے اور عوام کی پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے چیف ایڈیٹر نے اس دورے میں توسیع کی انہیں بخوشی اجازت دیدی تھی۔

"ہیلن ۔! کل والی تصویریں کیسی آئی ہیں۔ —— ؟ میرا فیچر اور ڈائری مکمل ہو چکی ہے ——" پہاڑ کی ڈھلان سے اترتے ہوئے کرسٹا نے سوال کیا۔

"اوہ ...... وہ جانگلی وومن والا —— ؟؟ ام ساری فلم بھیجدیں گا۔ ایڈیٹر آپ سلیکٹ کریں گا —— امارا فلم بوہٹ اچا بنا —— ایک دم گڈ ۔!"

ہیلن بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی —— برف پگھلنے کی وجہ سے آج ڈھلانوں پر زبردست پھسلن تھی اور دونوں کا کوئی بھی غیر محتاط قدم پلک جھپکنے کی دیر میں انہیں موت کے خونی پنجوں میں پہنچا سکتا تھا۔

"تو آج پوسٹ آفس چلیں —— موسم بھی اچھا ہے۔ راستہ کھل گیا ہو گا۔ پوسٹ مین یقیناً ڈاک لیکر آج شہر جائے گا۔ فیچر اور تصویریں اگلے سنڈے ایڈیشن کے لئے پہنچ جانی چاہئیں۔"

"اوہ . . . یس —— امارا فوٹو وومن ریج کے لئے ویری گڈ ہوئیں گا۔ ٹم وومن ریج کا رپورٹ لکھٹا —— ؟؟"

"اوہو —— ! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ فیچر لکھنے کے بعد میں تو سفر نامے میں ہی الجھی رہی حالانکہ میگزین ایڈیٹر نے خواتین کے صفحے کے لئے مشرقی کلچر پر مضمون بھی مانگا تھا۔ پچھلے خط میں اس نے لکھا تھا کہ پہلے مضامین اور فیچر بے حد پسند کئے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج رات رپورٹ مکمل کر کے کل تصویریں اور رپورٹ اکٹھی بھجوا دیں۔ کیوں —— ؟؟"

"او۔ کے۔ !!"

اونچی نیچی گھاٹیوں سے اتر کر اب وہ ایک نسبتاً ہموار پگڈنڈی پر آ گئی تھیں۔

"اب جالدی کرو۔ آج ہم بی فور ریج و لیج وومن کا ڈریس اینڈ ڈومیسٹک لائف کا فوٹو لینا مانگٹا۔"

ہیلن نے کیمرہ ایک کندھے سے اتار کر دوسرے پر لٹکا لیا اور دوربین آنکھوں سے لگا کر آس پاس کے مناظر کا نظارہ کرنے لگی۔

"ہیلن۔ گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہیں —— وہ سامنے دیکھو آبادی نظر آ رہی ہے۔ جھونپڑیوں اور مکانوں سے دھواں اٹھ رہا ہے ——" کرسٹا نے بھی دوربین آنکھوں سے لگا لی تھی —— آس پاس کے علاقے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بولی۔

"اب ذرا تیز تیز قدم اٹھاؤ فوٹوگرافی کے لئے یہ موسم بے حد اچھا ہے اگر سورج پھر بادلوں میں آگیا تو رزلٹ اتنا اچھا نہیں آئے گا ——"

دوسرا باب

"میم صیب جی۔ !"

ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیاں اترتے اترتے کرسٹا اور ہیلن نے گھوم کر پیچھے دیکھا ——— بوڑھا چوکیدار آخری سیڑھی پر کھڑا تھا۔

"ہوں ——— !"

"میم صیب جی ——— ! تم گڑھی کی طرف کو جاتا ہے تو امارا بات مانو . . . . . ."

اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گیا ——————— لہجہ اور انداز کچھ پراسرار سا تھا۔

"ہاں ہاں رک کیوں گئے۔ تم کچھ کہہ رہے تھے بابا ——— ؟" کرسٹا نے اسے ہمت دلائی۔

"ام کہتی ہے تم اودھر سے مت جاؤ . . . . . اودھر شمال کی طرف سے . . . . . . ! ام تم کو بتاتی ہے کہ وہ سامنے والی رستہ سیدھی گڑھی درہ آدم خان کو جاتی ہے . . . . تم مسافر ہوتی ہے نا ——— ام تم کو بولتی ہے ——— اپنا فرض جانتی ہے . . . . تم اودھر سے مت جاؤ ———" چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "اودھر سے جاؤ۔"

"مگر ادھر سے کیوں نہیں ——— ؟ اس راستے پر کیا ہے۔ ؟؟"

"بس میم صیب جی، ام تم کو بول دیا ——— تم ادھر کو کیوں جانا ہے —؟
ادھر کچ کچ ...... !!"

"کچ کچ ——— ؟ کیا مطلب —؟؟" چوکیدار کی نامکل بات کو سمجھنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

"اوہ .... بابا۔ !تم سنتا نئیں ——— ادھر کو جن بھوت رہتی ہے نا۔
تم سمجھتا جن بھوت ...... ؟؟" چوکیدار نے اشاروں سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"اوہ یو مین گھوسٹ ——— ؟؟ آچا.. آچا .... ٹم فکر نہ کارو .....
ام گھوسٹ سے نائیں ڈرتا ——— !" ہیلن نے قہقہہ لگایا اور وہ دونوں ہنستی کھلکھلاتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئیں۔ ٹیڑھی میڑھی پتلی سی پگڈنڈی سے گزرتی، نشیب وفراز طے کرتی وہ گڑھی درِ آدم خان میں پہنچیں تو گڑھی کے کچے پکے گھر اور جھونپڑیاں انکی دلچسپی کا مرکز بن گئیں —

چشمے کے قریب پہاڑ کے اندر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے غار نما گھر کے مکین پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس آگ کے گرد بیٹھے قہوے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ دو کمسن سی سرخ وسفید بچیاں ایک گائے اور چند بکریاں ہنکائے چرانے کیلئے نیچے وادی میں لئے جارہی تھیں —

بڑے بڑے گھیر دار میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی ڈھیر سارے چاندی کے زیورات سے لدی پھندی ایک نوجوان لڑکی تین گھڑوں کی قطار سر پر اٹھائے اور ایک گھڑا بغل میں دبائے چشمے سے پانی بھر کر آرہی تھی ——— اس کی رفتار میں اس غضب

کا توازن تھا جیسے عمر بھر وہ چاٹی ریس کے پرائیز جیتتی رہی ہو ــــ!!
وہ اس دور افتادہ اور پسماندہ پہاڑی علاقے کی تہذیب و ثقافت کا ایک مکمل اور جیتا جاگتا نمونہ تھی ــــــ وہ "بنت کوہسار" جسے دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی بھی شاید بمشکل ملتی تھی۔ . . . . مگر اسکے گالوں کی سرخی اور شادابی دیکھکر تو ایک ہی چیز ذہن میں آسکتی تھی "کشمیر کی کلی ــــ!"

" اوہ . . . وندڑفل ــــــ !!" ہیلن نے کیمرہ سنبھال لیا۔

لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہیلن نے مغرب کی روایتی اور کشادہ سی جوابی مسکراہٹ کے ساتھ جھٹ کیمرے کا بٹن دبا دیا۔

وہ لڑکی کے ساتھ باتیں کرتی اس کی رہنمائی میں آبادی کے اندر داخل ہو گئی تھیں۔ پتھروں اور مٹی سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے گھروندہ نما مکان کے واحد کمرے کے دروازے پر رک کر پہاڑی لڑکی نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی لیکن کرسٹا اور ہیلن کو ابھی اور آگے جانا تھا ــــ وہ مسکرا کر لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں ۔

اچانک وہ چونک اٹھیں ــــــ گانے کے ساتھ مختلف سازوں کی آواز ــ! کہیں دور سے آتی ہوئی ــــــ انہوں نے استہفامیہ انداز میں ایک دوسری کی طرف دیکھا ــــــ ساز و آواز کا یہ دلکش و دلنشیں آہنگ ان کا تجسس بڑھانے کے لئے کافی تھا۔

وہ اور آگے بڑھیں ــــــ پہاڑ کی ترائی میں سامنے نظر آنے والے پختہ، کشادہ اور خوبصورت سے مکان کے لمبے چوڑے صحن میں گڑھی کے لوگوں کا

ہجوم تھا ـــــــ ہجوم کے درمیان ایک گول دائرے کی شکل میں گاؤں کی عورتیں علاقائی رقص میں مشغول تھیں ـــــــ رقص اگر انوکھا نہ تھا تو بھی مغرب کی چمکتی دمکتی روشنیوں کے سیلاب میں شراب و نغمہ کے جلو میں والز، چا۔۔۔۔ چا۔۔۔ چا اور ٹوئسٹ کی عادی ان مغربی سیاح لڑکیوں کے لئے اس میں دلکشی و جاذبیت کے ہزاروں پہلو موجود تھے۔

رقص ختم ہوا ـــــــ رقاص عورتیں اور لڑکیاں اپنی اپنی جگہوں پر آبیٹھیں۔ چمکتی ہوئی ننگی تلواریں مردوں کے ایک گروہ کو پیش کی گئیں۔

ڈھول اور دوسرے علاقائی سازوں کے ساتھ مخصوص قسم کے لوک گیتوں کا تیز میوزک شروع ہوا ـــــــ بڑی بڑی گھیر دار شلواریں اور سلمہ و ستارہ سے آراستہ زنگار رنگ کی مخملیں واسکٹیں پہنے، ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے نوجوانوں کی یہ ٹولی حرکت میں آگئی۔

بالکل نئے ایکشن۔

نرالے انداز ـــــــ اور انوکھے رنگ ـــــــ !!!

دونوں لڑکیوں کے لئے اس علاقائی رقص کی ہر چیز تھرلنگ تھی اور ایکسائیٹنگ بھی ـــــــ !!

ہیلن کا ہاتھ کھٹا کھٹ کیمرے کا بٹن دبائے جارہا تھا ـــــــ ریلوں پر ریلیں ختم ہو رہی تھیں۔

علاقائی زبان کے لوک گیتوں کے بول کرسٹا اور ہیلن کی سمجھ سے بالاتر تھے لیکن یہ رقص۔۔۔۔۔ یہ ردم تو انکے لئے واقعی ایک نئی چیز تھی۔

یورپ کی مکس پارٹیوں اور کلبوں میں سستے جذبات کے سہارے راک اینڈ رول ...... چا.. چا.. چا اور ٹوئسٹ کی دھنوں پر تھرکتے ہوئے جسموں کے برعکس اس علاقائی ناچ کے ہر ہر ایکشن اور ہر ہر ادا میں بھرپور مردانہ جذبات و خصوصیات کا اظہار دیکھ کر وہ صحیح معنوں میں یہ رقص انجوائے کر رہی تھیں ——!!

ہیلن نے ان گنت تصویریں لے ڈالیں —————— زاویے بدل بدل کر۔ ہر ہر منظر کو کیمرے میں محفوظ کر لیا ——!!

ادھر سے فارغ ہو کر وہ محفل میں شریک خواتین کی طرف متوجہ ہوئیں جو بڑی حیرت سے ان اجنبی مہمانوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں — آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں ——!!

ان خواتین سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ گڑھی درِ آدم خان کے بوڑھے "حاکم" کی چار بیویوں سے بارہ بیٹیوں کے بعد چوتھی بیوی سے پہلا لڑکا پیدا ہوا ہے — اس کی جاگیر کا وارث —————— اپنے قبیلے کا ننھا منا سردار ——!!

اور یہ ناچ گانا اور دعوت اسی جشنِ مسرت کے سلسلے کی ایک کڑی تھی —

سردار کے گھر کی عورتوں نے ایک طرف پڑی ہوئی چارپائی پر بستر بچھا کر، اس پر پھولدار سرخ شنیل کی چادر ڈال کر اپنی "میم" مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا دی تھی —————— سمندر پار کے چٹی چمڑی والے حاکموں کے ازلی دشمن ہونے کے باوجود مہمانوں کی عزت افزائی اور خاطر و مدارات اس قبیلے کی پرانی روایت تھی۔!!

جشن کے اختتام کے ساتھ ہی کھانا شروع ہونے کا اعلان کر دیا گیا — میزبانوں کے پرزور اصرار پر کرسٹا اور ہیلن کو بھی یہ دعوت قبول کرنی پڑی —

کھانے میں بھنے ہوئے سالم دنبے کے علاوہ پہاڑی مکئی کی روٹی، ابلے ہوئے انڈے مرغیاں اور شہد کے ساتھ تازہ مکھن بھی شامل تھا ــــــ سویٹ ڈش کے طور پر ڈرائی فروٹ پیش کیا گیا۔

کھانے کے بعد مخصوص قسم کے خوشبودار قہوے کا دور چلا ــــــ قہوے کی ایک ایک پیالی پی کر کرسٹا اور ہیلن نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور جانے کیلئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

گھر کی خواتین نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، آپس میں کچھ کھسر پھسر کی اور پھر ایک عمر رسیدہ خاتون چادر سنبھالتی ہوئی دونوں لڑکیوں کی طرف بڑھی۔

"بیٹی۔ ! تم ادھر اوپر ڈاک بنگلے میں رہتی ہو نا ــــــ ؟ ذرا سنبھل کر، دیکھ بھال کر اس راستے سے واپس جانا ــــــ تم مہمان ہو۔ بے خبری میں کچھ کر نہ بیٹھو۔"

خاتون کی آواز میں نصیحت، ہمدردی اور تشویش کا ملا جلا عنصر شامل تھا۔

"کیا مطلب ــــ ؟"

"ادھر ــــ !" اس نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ڈیرہ ہے چھپل پائیوں کا۔ جھیل کے آس پاس کا یہ علاقہ اور وہ حویلی بھاری ہے۔ . . . . . . !! تم مسافر ہو۔ انجان اور بے خبر ہو ــــــ اس راستے سے بچ کر جانا ــــــ بس اب جاؤ، اللہ کی امان ــــ !" بزرگ خواتین نے باری باری دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا ــــــ وہ کچھ بھی تو نہ سمجھ پائیں ــــــ چوکیدار اور وہ عورتیں

..... یہاں ہر کوئی مبہم مبہم باتیں کرتا تھا ـــــ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے انداز میں ـــــ !! کچھ کہنا چاہتا تھا ـــــ کچھ چھپانا چاہتا تھا ـــ !!

یہ وسط فروری کی ایک تاریک سرد اور طوفانی رات تھی ـــــ باہر برف باری زوروں پر تھی ـــ روح تک کو منجمد کر دینے والی اس سردی میں کرسٹا کا جی لکھنے کو قطعی نہیں چاہ رہا تھا ـــــ کوشش کے باوجود موڈ ہی نہیں بن رہا تھا۔

آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور خلاف معمول وہ کرسی کی بجائے گرم بستر میں بیٹھی کافی کی چسکیوں کے ساتھ ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اکتا کر اس نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی ـــ کمرے کے کلاک نے ساڑھے گیارہ بجائے ـــــ کرسٹا چونک اٹھی ـــــ آج وہ کچھ مضطرب اور بے چین سی تھی ـــ !!

"ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے..... ؟ ٹھیک بارہ بجے وہ آئے گا...... شاید نہ بھی آئے .. !! مگر نہیں وہ ضرور آئے گا...... لیکن اس موسم میں... ..... ؟؟ اس طوفان میں...... ؟؟؟ اوہ .. ! خدایا وہ اپنا دشمن خود ہی کیوں ہے ـــــ ؟ خیر مجھے کیا ـــــ ! لیکن نہیں..... اوہ۔ یہ طوفان اور وہ جنرلی انسان ـــــ !! وہ سوچتی رہی ـــــ خواہ مخواہ ـــ !

اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی ـ

بارہا سر جھٹک کر اس نے اپنی بے چینی، بیقراری اور اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کی ـــــ ان اذیت ناک خیالات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا مگر... !!

باہر بجلی کی چمک اور بادلوں کی خوفناک گرج کے ساتھ کہیں قریب ہی بجلی گرنے کی

ہولناک آواز آئی اور پھر پہاڑوں میں اس کی صدائے بازگشت بھی ــــ!!

"اوہ... گاڈ ــــــ!!" کرسٹا کی آواز میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر غالب تھا ــــــ گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ بارہ کے ہندسے کی طرف سرک رہی تھی۔

پانچ منٹ۔

دس منٹ۔

پندرہ منٹ ــ

کرسٹا نے کمبل اتار کر ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر جلدی جلدی گرم کپڑے پہننے لگی۔

کوٹ ــ

جرابیں ــ

دستانے اور پھر۔

رین کوٹ ــــ!!

ٹارچ ہاتھ میں لئے وہ آگے بڑھی ــــــ دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ سوچا ــــ صرف ایک لمحے کے لئے ــــــ!! دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور دبے پاؤں برآمدے میں نکل آئی ــ

سرسراتی ہوئی تیز اور سرد ہوائیں جسم کے آر پار ہوئی جا رہی تھیں لیکن زندگی بھر یورپ کے برفانی موسموں کی شدّت کا مقابلہ کرنیکی عادی اس صحت مند اور نوجوان لڑکی کے لئے یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ــ

دور پہاڑوں اور وادیوں سے آنے والی گانے کی آواز آج کچھ مدہم سی تھی۔

ٹھٹھری ٹھٹھری اور برف آلود ــــــ!! الفاظ جیسے رک رک کر . . . .

ٹوٹ ٹوٹ کر۔ . منہ سے نکل رہے تھے اور کرسٹا کے اضطراب میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا ـــــــ آواز آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی گئی ـــــ گانے والا قریب آ گیا تھا شاید ــــــ !! تذبذب، پریشانی اور اُلجھن کے ملے جلے جذبات کے تحت کرسٹا کا دل دھڑک رہا تھا ـــــ سخت سردی کے باوجود اسکی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا اٹھے ـــ

گانے والا اب بہت قریب آ چکا تھا ـــــ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ـــ !!

وہ برآمدے سے نکل کر سڑک پر آ گئی ـــ

ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکی اور لمبے لمبے درختوں کے سایوں کی وجہ سے دونوں کے خط و خال ایک دوسرے پر واضح نہ تھے ـــ

کسی جاسوسی ناول کے پراسرار کرداروں کی طرح سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں ڈھکے چھپے وہ دو چلتے پھرتے سایوں کی طرح جان پڑتے تھے ـــ

" ٹھہریئے ـــــ! وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر آگے بڑھی ـــ

" کون ـــ ؟؟" یہ نسوانی آواز سن کر وہ ٹھٹھک سا گیا تھا ـــــ حیرت زدہ سا۔ آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہا تھا ـــــ آج تک کسی نے اسکے معمول میں رخنہ اندازی کی جرأت نہ کی تھی اور پھر عورت . . . . . . ! اس جنگل، اجاڑ اور بیابان جگہ پر ـــــ آدھی رات کے وقت ـــ !!

" میں . . . . میں . . . . . !" گھبراہٹ اور جھجک کی وجہ سے جملہ نامکمل رہ گیا۔ مردانہ سائے نے کچھ اور بھی حیران ہو کر اس نسوانی وجود کے سراپا پر گہری نظر ڈالی۔

تجسس آمیز ــ !!

" اندر آجایئے ۔" چند لمحوں کے بعد اپنی گھبراہٹ پر قابو پاکر اس نے مرد کو دعوت دی ۔

" مگر آپ ہیں کون ــــ ؟؟"

" یہی سوال تو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں ــــ !"

" مگر میرے پاس آپ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے بالکل وقت نہیں ۔"

اف کس قدر اعتماد تھا اس کی بھاری مردانہ آواز میں ــــ !!

کرسٹا کیا کہتی . . . . وہ استارت اور اکھڑ جو ثابت ہو رہا تھا ــــــ چند ثانیے خاموشی رہی ــــ بے نیاز اجنبی جانے کے لئے مڑا ۔

" سنیئے ۔ ! برف باری زوروں پر ہے ــــ " اپنی فطری جرأت و خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور اجنبی کا راستہ روک لیا ۔" رک جائیے ۔!"

" ہٹیے محترمہ ۔ ! مجھے جلدی ہے ۔ آپ میرا وقت ضائع نہ کریں ــــــ "

سپاٹ لہجے میں سختی تھی اور بے نیازی بھی ــ !

لیکن کرسٹا نے . . . . جو آج اس معمے کو حل کرنے کا مصمم ارادہ اور اس اجنبی شخص سے ہمدردی کا گہرا جذبہ لیکر آئی تھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی ۔

اسے اپنی جگہ مضبوطی سے جمے ہوئے دیکھ کر پراسرار اجنبی نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے نکل گیا ۔ شکست خوردہ سی کرسٹا اپنی جگہ پر کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی ۔

" اف ۔ ! اس قدر توہین . . . . ! ہونہہ ، جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو ۔

ایڈیٹ ——— !" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی اور تلملاتی ہوئی وہ سڑک سے برآمدے میں آگئی ۔

غصے سے بل کھاتی وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ہیلن کی بے ساختہ ہنسی نے استقبال کیا ——— کھڑکی میں سے وہ یہ سب تماشا دیکھ چکی تھی نا۔

کرسٹا کھول گئی ہیلن کی . . . یہ طنزیہ ہنسی دیکھ کر —— !!

" وحشی ، گنوار ، جنگلی ——— !" کوٹ ، دستانے اور جرابیں اتار کر وہ کرسی پر پٹختی جا رہی تھی ——— آج زندگی میں پہلی بار اس کا نسوانی غرور بری طرح مجروح ہوا تھا۔ اوپر سے ہیلن کا تمسخر آمیز رویہ ——— کرسٹا کا بس چلتا تو وہ منہ نوچ لیتی اس بدتمیز آدمی کا —— !!

" اسکے لئے سوچنا تو درکنار وہ اس قابل بھی نہیں کہ اس سے اظہار ہمدردی بھی کیا جائے ——— " بستر پر تقریباً گرتے ہوئے اس نے ہیلن کو اپنی رائے سے آگاہ کیا ——— " سٹوپڈ آدمی . . . . شاید ہیرو سمجھتا ہے اپنے آپ کو —— !"

" یس ۔ ناؤ یو آر رائٹ ـ "

" دیکھو ہیلن میں نے تم سے ہزار بار کہا ہے کہ اس سرزمین پر تم اردو کے علاوہ کوئی اور زبان نہ بولا کرو ورنہ . . . . . . !" ہیلن کی طنزیہ ہنسی سے بچنے کے لئے اس نے ایک دم موضوع بدل ڈالا ۔

" وارنہ فائن ——— ؟ بٹ مائی ڈیئر —— ! ام ٹمارا جیسا اردو لنگویج نائیں بیکا۔ یو آر ماسٹر ان اردو ——— جب ٹم ادھر کا لیڈی مافک ڈریس پہنتا ٹم بالکل ایسٹرن لگتا ——— ایک دم پاکسٹانی ——— " ہیلن نے بستر پر لیٹ کر

لحاف اوپر کھینچ لیا۔

"تم بھی تو سیکھو نا ــــ"

"سیدکا..... سیدکا ــــ اب ام سونا مانگتا اینڈ نو لیکچر.... نو ایڈوائس ــ"!

ہیلن نے جلدی سے لحاف میں منہ چھپا لیا۔

"نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے ــــ رات کا ایک بجنے کو ہے ــ" اس نے رسٹ واچ دیکھ کر ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

اندھیرے میں وہ دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی ــــ نہ جانے کیا کیا۔!!

باہر ساری رات برف گرتی رہی ــ

تیسرا باب

کئی دنوں کے بعد آج مطلع بالکل صاف تھا ——— آسمان دھل دھلا کر گہرا نیلا اور شفاف نکل آیا تھا ——— کالی گھٹاؤں اور بادلوں سے خالی ۔ نکھرا نکھرا ——— روشن روشن اور اجلا اجلا ——— !!

سورج دیوتا کرنوں کے رتھ پر سوار ایک نئی آن بان کے ساتھ نکلا اور اس کی جھلملاتی ہوئی کرنیں برف کے سفید قالین پر آنکھ مچولی کھیلنے لگیں ۔

حد نظر تک برف پوش چوٹیاں سنہری دھوپ میں جگمگا رہی تھیں اور اس زنگ فردوس وادی کے ندی ، نالوں ، چشموں اور آبشاروں میں سیال چاندی بہہ رہی تھی ۔

ہیلن اور کرسٹا دیر تک سوتی رہیں ——— لیٹ جاگیں ——— لیٹ ناشتہ کیا اور پھر باہر جانے کے لئے تیار ہو گئیں ۔ آج ان کا دور دور تک گھومنے پھرنے کا پروگرام تھا ۔

چوکیدار سے کہہ کر انہوں نے دوپہر کے کھانے کے لئے کچھ پھل ، انڈے ، سینڈوچ اور بسکٹ وغیرہ بیگ میں رکھوا لئے تھے اور تھرماس میں چائے بھی بھر لی تھی ۔

چوکیدار اور گڑھی کے دوسرے لوگوں کی نصیحتوں کے برعکس آج جذبۂ تجسس کشاں کشاں انہیں اس حویلی اور جھیل کی طرف لئے جا رہا تھا جہاں بقول گڑھی

والوں کے چھل پائیوں کا ڈیرہ تھا ـــــ بھوت پریت کا قبضہ تھا۔
بستی کے لوگ دن میں بھی ادھر جانے کی جرأت کرتے ہوئے گھبراتے تھے...
... لیکن یہ نڈر اور مہم جو یورپین دوشیزائیں یہ چیلنج قبول کر چکی تھیں۔
ان افواہوں اور داستانوں پر یقین نہ کرتے ہوئے آج ادھر جانے کا پروگرام بنا چکیں تھیں۔ ـــــ کسی کو کچھ بتائے بغیر ـــــ وہ ان قصے کہانیوں اور افواہوں کی حقیقت جاننے کے لئے بے چین تھیں ـــــ بے قرار تھیں ـــــ!!
اونچی نیچی پگڈنڈیوں اور ڈھلانوں سے سنبھل سنبھل کر گذرتی وہ چلتی گئیں۔
آگے اور آگے ـــــ اور اب وہ جھیل کے کنارے قدیم وضع کی ایک عظیم الشان لیکن تباہ شدہ اور ویران حویلی کے کھنڈرات کے قریب کھڑی تھیں۔
آبادی سے دور ـــــ چیڑ، چنار اور یوکلپٹس کے گھنے جنگل میں یہ پراسرار اور وسیع و عریض قلعہ نما حویلی قدیم مشرقی طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔
اپنے مکینوں کی عظمت رفتہ کی یادگار ـــــ! جسے دیکھتے ہی اس کے باسیوں کی شان و شوکت، دبدبے اور وقار کی ایک دھندلی سی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔

حویلی کے قریب گہری، نیلی اور شفاف جھیل میں کنول کے پھول کھل رہے تھے۔
چیڑ اور چنار کے گھنے جنگل کی بھائیں بھائیں کرتی خاموشی کا فسوں تھا اور یوکلپٹس کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی ـــــ کہیں کہیں خودرو پودوں اور درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر ایک آدھ کونپل پھوٹ نکلی تھی اور اس پس منظر میں حویلی کے کھنڈرات۔
گویا سارے کا سارا ماحول طلسمی تھا ـــــ الف لیلٰے کی داستانوں سے بھی

زیادہ پر اسرار . . . اور فطرت کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے والوں کے لئے ایک چیلنج —!!

" اوہ . . . . بیوٹی فل سائٹ —— !" ہیلن کا کیمرہ حرکت میں آگیا۔

لیکن . . . . . لیکن یہ کیا . . . . ؟؟

درختوں کے جھنڈ سے ماحول کی طرح ہی ایک پر اسرار سی بڑھیا نمودار ہوئی اور ان پر چیل کی طرح جھپٹی ۔

" تڑاخ —— "

پلک جھپکنے میں غضب ناک بڑھیا کا ایک زبردست طمانچہ ہیلن کے گال پر آن پڑا — پیشتر اس کے کہ لڑکیاں اس اچانک حملے سے سنبھل پاتیں بڑھیا کی نظر حیران و پریشان سی کھڑی کرسٹا پر پڑی اور وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی —— بڑھیا کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔

بدحواس لڑکی نے جھٹکا دے کر خود کو آزاد کیا اور دونوں چند قدم پیچھے ہٹ گئیں ۔

ہیلن کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا —— کرسٹا بھی خاصی نروس نظر آتی تھی ۔

" وہی . . . . وہی . . . . قسم خدا کی وہی —— !!" بڑھیا اب دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی ۔ " تم . . . تم مجھ سے نفرت کرتی ہو نا . . . . . . ؟؟ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا —— ؟؟؟"

ہچکیوں کے درمیان اس کے منہ سے بمشکل نکل سکا۔

ہیلن اور کرسٹا کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہ آیا —— وہ گم سم سی کھڑی کبھی بڑھیا اور کبھی ایک دوسری کی طرف دیکھ رہی تھیں ۔

بڑھیا بدستور سسکیاں لے رہی تھی ــــــ شدت غم سے اسکی بوڑھی ہڈیوں میں لرزش تھی ــــــ سر سے پاؤں تک ــ!!

گھنے جنگل میں چند بکریاں بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئیں اور آگے نکل گئیں ــــــ ان کے پیچھے ایک نوجوان چرواہا جس کا سانس شاید بکریوں کا پیچھا کرتے کرتے پھول چکا تھا نمودار ہوا ــــ لڑکیوں کو وہ بڑھیا کے قریب کھڑے دیکھ کر جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا ــــــ مارے حیرت کے اس کا منہ آدھا کھلا ہوا تھا ۔

کرسٹا نے ہمت کر کے بڑھیا کی طرف قدم بڑھائے ــــــ وہ اپنی مدافعت کے لئے بھی پوری طرح تیار تھی ۔

"شی ــــــ !" چرواہے نے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کی ۔

"میم صاحب ۔ ! اسے کچھ نہ کہو ۔ پگلی ہے بیچاری ــــــ" وہ دھیرے سے بولا ۔

"پگلی ــــــ؟" دونوں لڑکیوں کے منہ سے بیک وقت نکلا ۔

بڑھیا نے ایک قہر آلود نگاہ چرواہے پر ڈالی اور درختوں کے گھنے جھنڈ میں غائب ہوگئی ۔

"ہاں . . . ہاں پگلی ــــــ!" وہ دبے دبے لہجے میں بولا ۔ "میم صاحب ۔ ! اس نیلی چھت والے کے کھیل نیارے ہیں ۔ کبھی یہی پگلی اس علاقے کے سب سے بڑے خان کی بیوی تھی ــــــ اس شاندار حویلی کی مالک ــ!

ہا . . . . . . ہا . . . . . !" اس نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیا ۔

"حویلی کی مالک ـــــ؟؟" کرسٹا نے متعجب آواز میں پوچھا۔

" Owner of this building ؟" ہیلن نے ہاتھ سے حویلی کے کھنڈرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے چرواہے کی بات پر یقین نہ آیا تھا ـــــ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

"ہاں . . . ہاں اس حویلی کی مالک ـــــ پر اب تو کئی سالوں سے اس حویلی پر جنوں اور بھوتوں کا قبضہ ہے ـــــ رات کے وقت یہاں سے چلنے پھرنے اور گانے بجانے کی آوازیں بھی آیا کرتی ہیں ـــــ میم صاحب جی - ! اللہ پاک کی قسم میں نے اپنے کانوں سے یہ آوازیں سنی ہیں ـــــ گڑھی کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہاں روحوں کو چلتے پھرتے دیکھا ہے . . . . . ہنسنے اور رونے کی آوازیں سنی ہیں اور اب . . . . اب تو لوگ دن کی روشنی میں بھی ادھر سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں ـــــ آپ شاید پہاڑ کی چوٹی پر اس ڈاک بنگلے میں رہتی ہیں ـــــ؟؟ آپ فوراً واپس چلی جائیں ـــــ آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیئے تھا ـــــ !"

"مگر تم جو آئے ہو ـــــ؟"

"میں تو ان بکریوں کی وجہ سے مجبور ہو کر آیا ہوں ـــــ یہ بے قابو ہو کر ادھر آنکلیں تھیں اور آپ جانیں یہی تو ہم غریب پہاڑیوں کی دولت ہے یا پھر تھوڑی سی زمین ـــــ !"

چرواہے نے دونوں ہاتھ منہ کے آگے رکھ لئے اور بکریوں کو بلانے کے لئے آوازیں لگانے لگا ـــ

"موتی ـــ !

دگوشی ـــــ! یاسمینہ ـــ!! وہ بکریوں کے نام لے لیکر انہیں پکار رہا تھا۔

" لیکن یہ پگلی رہتی کہاں ہے ـــــ؟" کرسٹا نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ۔

" حویلی کی پرلی طرف ـــ ادھر ایک دو ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں ہیں ـــــ پرانے وقتوں کی ـــــ ادھر جھیل کے کنارے ـــ!" اس نے اشارے سے بتایا۔

" وہ تمہاری روحیں اور جن بھوت اسے کچھ نہیں کہتے ـــــ؟؟" کرسٹا کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی ۔

اچانک پشت کیطرف جنگلی باڑ کے پیچھے گھنے درختوں میں سوکھے پتوں پر کسی کے پاؤں کی مدہم چاپ اور پھر پتوں کی چرچراہٹ سنائی دی ـــــ چرواہے کا رنگ فق ہوگیا۔

"م.....م.....میم صاحب ! بھ.....بھ.....بھوت !"
مارے خوف کے اسکی گھگھی بندھ گئی ۔

کرسٹا اور ہیلن نے نگاہیں درختوں کے جھنڈ پر جمادیں ـــــ " ادھر کوئی ہے !"
پتوں پر [illegible] آواز دوبارہ آئی ـــــ اب چرواہا تھرتھر کانپ رہا تھا۔
اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے خوف اور دہشت کی علامت تھے ۔
اور پھر گھنی باڑ کے پیچھے سے تین سر نمودار ہوئے ـــــ سفید، سیاہ اور براؤن ـــــ!! تین بکریوں کے سر ـــ!!
کرسٹا اور ہیلن بے ساختہ ہنس پڑیں ـــــ چرواہا کھسیانا سا ہوگیا۔
کرسٹا اور اس کی دوست کی ہنسی رد کے نہ رکتی تھی ۔

"میم صاحب ۔ ! یہ مذاق نہیں ۔ آپ یقین کیجئے اس حویلی میں ہر روز رات کو آپ ہی آپ دیئے جلتے اور بجھتے ہیں ۔ کئی بار گانے بجانے کی آوازیں بھی گونجا کرتی ہیں ۔ بھلا میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا ——— ؟ میں تو آپ کے بھلے کے لئے ہی کہہ رہا ہوں کہ آپ ادھر نہ ٹھہریں ——— آپ ہماری مہمان ہیں اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم سب کی بدنامی ہوگی ۔"

" اچھا بھائی ۔ ! شکریہ، تمہاری اس نصیحت کا" ۔ کرسٹا نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا ۔ یونہی ۔

"چلئے میں آپ کو ڈاک بنگلے والی سڑک تک چھوڑ دوں ۔" اس نے روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں ۔

" نہیں تم جاؤ ۔ ہم خود ہی چلی جائینگی ۔"

" آپ کی مرضی ۔" وہ بکریوں کو ہنکاتا ہوا آبادی کی طرف ہو لیا ——— جنگل میں اس کی بانسری کی آواز دھیرے دھیرے دور ہوتی چلی جا رہی تھی ۔

"بہت خوب ۔ !" کرسٹا مسکرائی ۔ " یہ مشرق ہمیشہ سے ایسی ہی پراسرار داستانوں اور قصے کہانیوں کا مرکز رہا ہے ——— بیسویں صدی کی دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے مگر یہ لوگ ابھی جنوں بھوتوں کے چکروں سے ہی نجات حاصل نہیں کر سکے ۔ آؤ ذرا اس پگلی بڑھیا کی جھونپڑی تک چلیں ——— " اس نے ہیلن کو دعوت دی ۔

" اس سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔"

" اوہ . . . . نو ـــ نائیں ـــــ ام دن مور بلیپ نہیں کھانا مانگتا ــــ سٹل بھلتا ــــ "

اس نے اپنے بائیں گال پر ہاتھ پھیرا جہاں بڑھیا کی پانچوں انگلیوں کے نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے ـــــــ کرسٹا ہنسنے لگی۔

"ارے بھئی چلو نا ـــــــ نئے فیچر کے لئے شاید کچھ مواد مل جائے ـــــــ تم فوٹو لینا۔ میں اسے باتوں میں الجھائے رکھوں گی ـــــــ وہ مجھ پر مہربان معلوم ہوتی ہے۔ ویسے ابھی سے ریسٹ ہاؤس جا کر کریں گے بھی کیا ـــ؟؟

"اوں ..... ہوں ـــ!" ہیلن نے نفی میں سر ہلایا ـــــ وہ مزید تھپڑ کھانے کے لئے قطعاً تیار نہ تھی۔

"چلو بھی ـــ" کرسٹا نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

ہیلن بادل نخواستہ اس کے ساتھ چل پڑی ـــــ اور کرتی بھی کیا۔ کرسٹا ہمیشہ اپنی بات منوایا کرتی تھی۔

جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر دونوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال و جواب ہوئے اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر ڈرتے ڈرتے کرسٹا نے اندر جھانکا۔

پگلی مصروف تھی ـــــــ بے حد مصروف ـــ!!

سامنے دو تین سوٹ کیس کھلے پڑے تھے اور طرح طرح کے رنگین لباس پگلی کے سامنے زمین پر پھیلے ہوئے تھے ـــــــ زنانہ اور فیشن ایبل لباس ـــ!!

کرسٹا اور ہیلن حیرت زدہ سی ہو کر ایک دوسری کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اس علاقے کے مخصوص لباسوں کے علاوہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کے قیمتی اور ماڈرن لباس بھی تھے۔

قوس قزح کے رنگوں کے ریشمی دوپٹے ۔!

کرتے، پاجامے ۔!

سلکی اور کامدانی ساریاں ۔۔۔ اور

پرنٹڈ قمیضوں کے ساتھ میچ کرتی ہوئی شلواریں ۔۔۔۔!

بعض کپڑے سجاوٹ کے طور پر سامنے والی دیوار کے کیلوں کے ساتھ بھی لٹک رہے تھے ۔

کرسٹا نے دیکھا کہ ایک بے حد شوخ رنگ کا ریشمی دوپٹہ بڑھیا نے اپنے ملگجے اور سلوٹوں بھرے ڈھیلے ڈھالے لباس پر بڑے سلیقے سے اوڑھ رکھا تھا ۔

ابلتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش میں وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی ۔

۔ نچلے ہونٹ سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا اور جھریوں بھرے چہرے پر ایک ناقابل بیان دکھ کی پرچھائیاں دور سے بھی نمایاں معلوم ہوتی تھیں ۔

کرسٹا اور ہیلن کے قدموں کی چاپ سن کر بڑھیا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اوپر اٹھائیں ۔

درد و غم ۔

مایوسی ۔

بے بسی اور

روحانی کرب ۔۔۔!!

کیا کچھ نہ تھا ان بوڑھی آنکھوں میں ۔۔۔؟

دونوں لڑکیاں چپ چاپ دروازے میں کھڑی تھیں ۔۔۔۔۔ الجھی الجھی اور

حیران حیران سی — !

"آؤ . . . . آؤ ——!" خلاف توقع بڑھیا نے ایک کشادہ مسکراہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا۔ لڑکیوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی —— شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا تھا۔

"آؤ بیٹی . . . . آؤ . . . . میرے قریب —— ڈرو نہیں ۔ یہ دکھی بڑھیا تمہیں کچھ نہیں کہے گی —— کہہ بھی کیا سکتی ہے —؟"

چارپائی سے کپڑے ایک طرف سمیٹ کر اس نے لڑکیوں کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی —— جھجکتی ہوئی وہ آگے بڑھ کر چارپائی کے ایک سرے پر ٹک گئیں۔ ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ——!

اور بیچاری بڑھیا آپ ہی آپ بولے جا رہی تھی۔

"وہ چرواہا کہتا تھا . . . . میں پاگل ہوں . . . . دیوانی —— ! سب لوگ یہی کہتے ہیں . . ہا . . . . ہا . . . . ہا ——!" ایک دردناک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"تم بھی یہی کہو گی ۔ پر . . . . پر تم نے کبھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے —؟؟؟"

وہ کرسٹا سے مخاطب تھی اور اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ جیسے کرسٹا کے چہرے کو ٹٹول رہے تھے۔

"وہ . . . . وہ ایسی ہی تو تھی . . . . . . میری مغیرہ گل . . . . میرے جگر کا ٹکڑا —— میرے پاس اس کی تصویر ہے ۔ میں تمہیں دکھاؤں گی . . . . شیشہ سامنے رکھ کر اس تصویر کو اور اپنی شکل کو دیکھو ۔ ہو بہو وہی —— سرمو بھی

تو فرق نہیں ـــــ وہی نیلی آنکھیں اور سنہری بال۔!"

تڑپتی اور کانپتی ہوئی انگلیاں کرسٹا کے نرم و نازک ہونٹوں پر آن رکیں۔

"یہ سُرخ سُرخ ہونٹ۔ــــ گلاب کی پتی کی طرح تروتازہ ــــــ وہی چہرہ، ہنستا مسکراتا ہوا ــــــ !" بڑھیا کی بے تاب نگاہیں کرسٹا کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں تھیں ــــ بڑی ہی نرمی اور پیار کے ساتھ ــــــ !! وہ کچھ محسوس کر رہی تھی ــــ کوئی بہت ہی گہرا اور حقیقی جذبہ ــ!!

ایک مجبور و لاچار ممتا کی ساری تڑپ ان بوڑھی انگلیوں میں سمٹ آئی تھی۔ کرسٹا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"یہ . . . . . یہ اس کے کپڑے ہیں۔" بڑھیا نے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ایک خوبصورت اور قیمتی جوڑا اٹھایا اور کرسٹا کی طرف بڑھا دیا۔ "مجھے پہن کر دکھاؤ۔ ایک بدنصیب ماں کو ــــــ ایک پگلی بڑھیا کو ـــ"!!

رندھے ہوئے گلے سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے . . . . اور پھر آنسوؤں کا سیلاب ــــــ ! دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے وہ بلک رہی تھی۔ شدت جذبات سے اس کا تمام بدن بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

لڑکیاں کچھ بھی تو نہ سمجھ پائیں۔

بڑھیا کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے زمین پر گر پڑے تھے اور ان سے نکل کر ایک تصویر بھی ــــــ پرانی سی ــــــ قدرے میلی اور مڑی تڑی ہوئی ــــــ !!

کرسٹا نے جھک کر تصویر اٹھالی اور . . . . اور پھر سارے جہان کی حیرت اسکی نیلگوں آنکھوں میں سمٹ آئی ــــــ تصویر اس کی اپنی تھی مگر مشرقی لباس میں۔!!

" اوہ ... . گاڈ — !! بیساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ " میری تصویر ... ؟؟
... . یہاں — ؟؟ اس بڑھیا کے پاس . . .. ؟؟ " وہ دم بخود تھی۔
" اف .. . ! یہ معمہ .... ؟؟ یہ راز . . . . . ؟؟ " اس کا دماغ جیسے سن ہو کر رہ گیا۔

تصویر اس کے ہاتھ سے گر پڑی جسے آگے بڑھ کر ہیلن نے اٹھالیا۔

" اوہ .... . ! مائی گاڈ ... .. اٹ۔ از۔ یو — ؟؟ " وہ تقریباً اچھل پڑی۔ " ایسٹرن ڈریس میں ... بالکل ایک مانک — " وہ کبھی فوٹو اور کبھی کرسٹا کے چہرے کیطرف دیکھ رہی تھی — دماغ پر ہزار زور دینے کے باوجود بھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

" کرسٹا۔ ! آئی تھنک ایک ٹائم تم ایسٹ میں بارن ہوا، سیکنڈ ٹائم ویسٹ میں۔ بائی گاڈ۔ ! بالکل ایک مانک۔ I cannot understand it

وہ حیرت زدہ نگاہوں کے ساتھ بار بار کرسٹا اور تصویر کو گھورے جا رہی تھی۔

ایک نامعلوم سا خوف اسکے ذہن کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا اور ... . حویلی اور اس علاقے کے متعلق مشہور بھوت پریت کی داستانیں اسے حقیقت بنتی نظر آرہی تھیں۔ !!

چوتھا باب

"تم حیران ہو. . . . . . ؟ سوچ رہی ہو. . . . . ؟ اس تصویر کے متعلق. . . . . ؟؟ مغیرہ گل کے بارے میں. . . . . ؟؟ آہ. . . . . ! تم کیا جانو. . . . . میں بتاؤں. . . . . . ؟" اس نے ایک مجبور مسکراہٹ کے ساتھ کرسٹا سے پوچھا۔

"سنو ___! وہ میرے جگر کا ٹکڑا تھی. . . . . . میری اکلوتی بیٹی. . . . . . . میرا خون. . . . . میرا سرمایہ. . . . . ! میری خوشیوں، میری آرزوں اور امنگوں کا واحد مرکز. . . . . . ! میرے دکھ سکھ کی شریک ___!!"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی ___ بڑی مدہم آواز میں ___!!

"تم جانتی ہو. . . ؟ نہیں ۔! بھلا تمہیں کیا معلوم. . . . میں نے کتنے دکھ اٹھا کر . . . . . کتنے نازوں سے اسے پالا تھا. . . . اس کے باپ نے تو ولایت جا کر ایک میم سے شادی رچالی تھی. . . . . !" ماضی کی تلخ یادوں سے غم واندوہ کا ایک بادل سا بڑھیا کے جھریوں زدہ چہرے پر لہرا گیا ___ مگر وہ رکی تو نہ تھی۔

"وہاں اس نے دوسری شادی کر لی ___ اپنی پسند کی شادی. . . . . میں اسکے معیار کے مطابق جو نہ تھی. . . . . پر اس میں میرا قصور بھی کیا تھا ___؟؟ ہماری شادی تو ہوش سنبھالنے سے پہلے بچپن میں ہی کر دی گئی تھی ___

وہ گاؤں کے حاکم کا بیٹا تھا اور میں. . . . . میں اس کی ماموں زاد بہن ___!

جو پیدا ہوتے ہی اس کے نام سے منسوب کر دی گئی تھی ــــــ گاؤں کی ایک سیدھی سادی گھریلو سی لڑکی ــــــ بے وقوف، جنگلی، گنوار اور کم عقل ـ !!" ایک طنزیہ مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر پھیل گئی ـ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ پھر بولی ـ "وہ یہی کہا کرتا تھا . . . . وہ شہر کے بہت بڑے انگریزی کالج میں پڑھتا تھا نا ــــــ ! اور میں ایک بیوقوف دیہاتن . . . . جس کی تعلیم گھر بس قرآن پاک اور چند ابتدائی اردو فارسی مذہبی کتابوں تک محدود تھی ــــــ جسے دنیا کا کچھ پتہ نہ تھا . . . . جو کبھی اس گاؤں سے باہر بھی نہ نکلی تھی . . . : ہا ہا . . . . پر وہ تو میرا مجازی خدا تھا ـ میرا سب کچھ ــــــ میرا شوہر . . . . میرا آقا . . . . سارے آقاؤں کیطرح جابر اور سخت گیر ـ !!"

وہ پھر ہنس پڑی ــــــ ایک انوکھی ہنسی ــــــ بے موقع و بے محل ــــــ ! اور تب . . . کرسٹا نے سوچا " ہنسی کی بھی کتنی قسمیں ہوتی ہیں . . اور بھلا . . . اس عجیب سی معنی خیز ہنسی کو کیا نام دیا جا سکتا ہے ــــــ ؟ طنز، دکھ، حسرت، مجبوری اور بے بسی کے ملاپ کا بھی کوئی نام ہو سکتا ہے ــــــ ؟؟ اف کس قدر کڑواہٹ تھی اس کے لہجے میں ــــــ !" لڑکیاں بڑے جذب و انہماک سے سن رہی تھیں اور وہ اپنی ہی دھن میں مگن بولے جا رہی تھی ـ

" اپنے ملک سے ایم ـ ایس ـ سی پاس کر کے وہ جرمنی گیا تھا . . . . اور وہاں سے اس کا خط آگیا ــــــ چند ماہ بعد ہی اس نے وہاں ایک میم سے شادی کر لی تھی . . . . وہ پڑھی لکھی تھی نا ــــــ ؟ اس کے معیار اور پسند کے مطابق ـ

میں کیا کر سکتی تھی .... سوائے رات رات بھر جاگ کر خدا کے حضور گڑگڑانے کے
۔ آخر میرے مولا نے میری دعائیں سن لیں ——— کچھ عرصے بعد ہی اسکا
باپ جو گاؤں کا حاکم تھا ایک مخالف قبیلے سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔
باپ کی اچانک موت پر وہ واپس وطن آیا تو قبیلے کے لوگوں نے اس کو سردار چن
لیا ——— قبیلے کی سرداری کے ساتھ ساتھ وہ علاقے کا بڑا جاگیردار بھی تھا نا۔
اور اب اسے اپنے باپ کی ساری ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں ——— وہ اپنی
میم بیوی کو وہیں چھوڑ آیا تھا..... اس وعدے پر کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ
اسے بھی اپنے پاس بلالے گا مگر..... ہمارے قبیلے کے غیرت مند پٹھان جو صدیوں
سے کافر فرنگیوں کے خلاف سینہ سپر رہے تھے، بپھر گئے ۔ اپنے خاندان کی بیٹی
کے مقابلے میں ایک میم کو وہ اپنی سردارنی بنانے کو ہرگز تیار نہ تھے اور تب کئی دن
کے جھگڑے کے بعد ..... قبیلے کے بزرگوں کے دباؤ کی وجہ سے خان نے اپنی
میم بیوی کو طلاق بھیج دی ۔"
پگلی بڑھیا نان سٹاپ بولے چلی جا رہی تھی ——— اور کرسٹا کا ذہن اسے
برسوں پیچھے لے گیا ——— دور...... بہت دور......!!
وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئی ...... دھند آہستہ آہستہ چھٹی تو اسکے ذہن
کے پردے پر دو چہرے نمودار ہوئے ...... آہستہ آہستہ یہ چہرے واضح اور
نمایاں انسانی وجود کی شکل اختیار کرتے گئے ۔
"ممی ——— ! دیکھیں نا، لزا اور مارگریٹ کے ڈیڈی ان کے لئے اتنی اچھی فراکیں
کھلونے اور مٹھائیاں لائے ہیں ——— میرے ڈیڈی کہاں ہیں ۔؟

وہ کیوں نہیں لاتے ——— ؟؟" ایک کمسن بچی ماں کے گلے میں باہیں ڈالے معصومانہ انداز میں شکوہ کر رہی تھی۔

ماں نے ٹنگ ایک طرف رکھ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا ——— وہ اس کے سوالات کو نظر انداز کر کے اسے ادھر ادھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ممی ——! میرے ڈیڈی کہاں ہیں ۔ ؟ کہاں ہیں میرے ڈیڈی ——— ؟ وہ کب آئینگے ——— ؟" ایک ذہین اور معصوم بچی کا جذبۂ تجسس آج اپنی تسکین چاہتا تھا ——— وہ ادھر ادھر کی باتوں سے بہلنے کے موڈ میں قطعی نہ تھی۔

"آپ بولتی کیوں نہیں ——— ؟ بتائیے نا ——— !" ماں کی خاموشی سے اُلجھ کر وہ اپنا سوال بار بار دہرا رہی تھی ——— ضد کر رہی تھی ——— "آپ بتاتی کیوں نہیں کہ میرے ڈیڈی کہاں ہیں ——؟"

"پاکستان ——— !" بیٹی کے سوالات سے کوئی راہ فرار نہ پا کر ماں کے منہ سے نکل ہی گیا۔ اس کی آواز میں ہزاروں نوحے پوشیدہ تھے۔

"پر ممی ——! میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں ——— وہ کب آئیں گے ——؟" چھوٹی سی سرخ و سفید گڑیا کے لہجے میں اشتیاق، حسرت اور انتظار کی کچھ ایسی ملی جلی کیفیت تھی کہ ماں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اُبل پڑے۔

"کبھی نہیں بیٹی ——— !" ماں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ بیٹی کے سر پر رکھ دیا۔

ہونٹوں کو بھینچ کر وہ بڑی مشکل سے سسکیاں دبا رہی تھی ——— کمسن بیٹی سے اپنی کمزوری چھپانے کی خاطر ———!!

"تو پھر ہم ان کے پاس چلیں ——— ؟" ماں کی دلی کیفیت سے بے خبر وہ سوال

پر سوال کئے جا رہی تھی۔ "میں اپنے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھ لوں۔؟؟"

"نہیں بیٹے۔"

پھنسی پھنسی، مدھم آواز کہیں بہت دور سے آئی تھی۔

"ممی۔ ! وہ ہمیں یہاں چھوڑ کر چلے کیوں گئے ـــــ؟؟ لزا کے ڈیڈی بھی گئے تھے لیکن وہ تو تھوڑے دنوں کے بعد واپس بھی آ گئے تھے۔ میرے ڈیڈی کیوں نہیں آتے ـــــ؟؟ لزا کے ڈیڈی تو اسکے لئے کھلونے اور ٹافیاں بھی لائے تھے۔"

اس نے ماں کا سر اپنے چھوٹے چھوٹے کومل سے ہاتھوں میں لیکر اپنی طرف زبردستی گھمایا۔

" اوہ . . . گاڈ ـــــ ! چپ ہو جاؤ کرسٹا ـــــ !" ماں چلائی۔

ذہین بیٹی کے سامنے آج وہ خود کو بالکل بے بس پا رہی تھی ـــــ سینے کے اندر ابلتے ہوئے لاوے پر قابو پانے کی کوشش میں اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ دل جیسے پھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"چپ ہو جاؤ ـــ چپ ہو جاؤ ـــــ کیوں چپ ہو جاؤں ـــــ؟؟ بتائیے میرے پاپا کہاں ہیں ـــــ؟؟ بتائیے ـــــ آپ چپ کیوں ہیں۔؟ بولتی کیوں نہیں ـــــ؟؟"

بیٹی کے یہ تیور اور انداز ـــــ یہ سوالات کی بوچھاڑ ـــــ ! ماں نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک اسے تاریکی میں رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور . . .

. . . یہ کہ اسے اب اس حادثے سے آگاہ کرنے کا وقت آ گیا ہے اور پھر . . . چھپانے سے فائدہ ـــــ؟ یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا بھلا ـــــ؟ اور اب جب کہ اسے اور اسکی معصوم بیٹی کو کسی مضبوط سہارے کے بغیر . . . .

تن تنہا ہی حوادثات زمانہ سے نبرد آزما ہونا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو بیٹی کو عزم و ہمت اور خود اعتمادی کی نعمت سے مالا مال ہونا چاہیئے ـــــ آخر طفل تسلیوں کی ان عارضی بیساکھیوں کے سہارے کب تک ـــــ ؟ اسے ذہنی طور پر یہ سب کچھ برداشت کرنے کیلئے تیار ہونا چاہیئے کہ اسے صرف اپنی صلاحیتوں کی بدولت اس دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے ـــــ اور پھر بیٹی کے مستقبل کی خاطر۔۔ ۔ ۔ ۔ اس میں عزم و ہمت اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے اس نے بیٹی کو تمام حقیقت سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"بیٹی ـــــ! وہ بزدل تھا۔"

"بزدل ـــــ؟" بیٹی کا ذہن باپ کے متعلق یہ رائے تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا شاید۔

"ہاں بزدل ـــــ! وہ اپنی خاندانی روایات سے بغاوت نہ کر سکا ـــــ اس نے یہاں آکر مجھ سے لومیرج کی لیکن اپنے ملک پہنچ کر اسے یاد آیا کہ وہ تو اپنے قبیلے کے سردار کا بیٹا ہے ـــــ ایک جاگیردار کا بیٹا ـــــ شادی شدہ اور ایک بچی کا باپ ـــــ اور اسکی پہلی بیوی اسکے اپنے خاندان کی لڑکی ہے اور یہ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قبیلے کے قدامت پسند بزرگ اپنے خاندان کی بیٹی کے مقابلے میں ایک غیر ملکی "میم" کو قبول کرنے پر تیار نہیں ـــــ وہ اس سے ناراض ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اس نے مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے چھوڑ دیا۔

مجھے طلاق بھیج دی ـــــ!" زخمی لہجے میں ایک پھنکار تھی ـــــ عزت نفس کے کچلے جانے کا شدید احساس ـــــ!

"مگر کیوں۔؟" وہ ایک دم بجھ کر رہ گئی۔ ماں کا جواب اس کیلئے بالکل غیر متوقع تھا۔ "طلاق

کوئی بہت ہی گندی اور خوفناک سی چیز ہے"۔ وہ بس اتنا ہی سمجھ سکی تھی۔

وہ مجبور تھا نا۔ مشرقی معاشرے کے جابر قوانین کے ہاتھوں۔"!

دکھی ماں کے لہجے میں ایک حقارت آمیز طنز تھا اور ہونٹوں پر ایک دردناک مسکراہٹ ـــــ!! آج برسوں کے بعد کمسن بیٹی کے معصومانہ مگر سنگین سوالات نے دل کے زخموں کو کرید ڈالا تھا ـــــ ادھیڑ ڈالا تھا . . . . ان زخموں کو جو وقت کے ساتھ مندمل ہونے کی بجائے اب ناسور بن چکے تھے اور وہ . . . . . جو اپنی کمسن بیٹی اور اس کے مستقبل کی خاطر دل کے درد کو سینے میں چھپا کر مسکراتے رہنے کی عادی ہو چکی تھی بیٹی کے احساسِ محرومی کو دیکھ کر زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی ـــــ ضبط کے بندھن ایک دفعہ جو ٹوٹے تو سسکیوں آنسوؤں اور آہوں کے طوفان پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔!

"ممی۔! ممی ـ"! تڑپتی بلکتی ماں کی حالت دیکھ کر وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ ایک دم سے پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ روتی کیوں ہیں ـــــ؟ چپ ہو جائیے نا ممی ـــــ"! وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ماں کے آنسو پونچھ رہی تھی ـــــ اپنی سمجھ کے مطابق اسے تسلیاں دے رہی تھی ـــــ اپنے بھولے بھالے اور پیارے سے انداز میں۔!

"ممی۔! نہ روئیں نا ـــــ میں آپ کو اپنے کھلونے لا دوں ـــــ؟؟ ٹافیاں دوں ـــــ؟؟ اچھے بچے نہیں رویا کرتے ـــــ آپ بھی اچھی بیٹی ہیں نا ـــــ ممی نہ روئیں ـــــ میری اچھی ممی ـــــ"! اس نے ماں کا ماتھا چوم لیا۔

"بیٹی ــــ!" اس کی بھولی بھالی ادائیں دیکھ کر ماں نے بیتابانہ کھینچ کر اسے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "میری بیٹی ــــ! میری کرسٹا ــــ" وہ اسے دیوانہ وار چوم رہی تھی ــــ۔ اس ننھے سے وجود کے علاوہ زندگی میں اور رہ بھی کیا گیا تھا۔ اس کے بعد حساس کرسٹا نے سمجھ لیا کہ اس کی ماں ہی اس کی معصوم تمناؤں اور آرزؤں کا واحد مرکز ہے ــــ اس نے ماں سے دوبارہ کوئی استفسار کیا نہ کوئی فرمائش ــــ! جو مل گیا کھالیا، جو ماں نے لادیا، پہن لیا اور پھر اپنے کام میں مگن ہوگئی۔

وقت نے ماں باپ کے تعلقات کی نوعیت اور علیحدگی کا مفہوم اسے بہت اچھی طرح سمجھا دیا تھا ــــ سال پر سال گذرتے چلے گئے۔

کرسٹا کی ماں ایک فیکٹری میں ملازم تھی ــــ بیٹی کے روشن مستقبل اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اس نے صبح و شام کام کیا ــــ عام مغربی ماؤں کے برعکس اس نے دوسری شادی بھی نہ کی ــــ وہ اپنی بیٹی کو ایک باعزت اور باوقار مقام پر دیکھنا چاہتی تھی نا ــــ!

اس نے کرسٹا کو ماں اور باپ دونوں کا پیار اور شفقت دی تاکہ اس کی بیٹی کسی جذباتی و نفسیاتی محرومی کا شکار نہ ہوجائے۔

"ممی ــــ! میں یونیورسٹی میں اردو زبان اور مشرقی کلچر پر ریسرچ کرنا چاہتی ہوں ــــ!" یورپ کی آزاد اور رنگین فضاؤں میں پرورش پانے کے باوجود شاید یہ ایک مشرقی باپ کے خون کا اثر اور لاشعور میں چھپا ہوا احساس محرومی تھا . . . . کہ کالج میں داخلے کے وقت مضامین لیتے ہوئے اس نے مشرقی علوم، مشرقی زبانوں اور خصوصاً "اردو" کا انتخاب کیا ــــ یونیورسٹی گئی تو ان علوم پر ریسرچ کی . . .

تھیسس لکھا اور اپنی پرائیویٹ لائف میں بھی اردو کا مطالعہ کچھ اس انداز سے جاری رکھا کہ اس نوجوانی میں ہی کرسٹا کا شمار جرمنی میں زبان اردو کے چند چوٹی کے ماہرین میں کیا جانے لگا تھا۔

ولیسٹ جرمنی کے سب سے بڑے اخبار کی لیڈی ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں کافی اہم تھیں لیکن . . . . فراغت کے چند گنے چنے لمحات میں ایشیائی کلچر اور زبانوں کا مطالعہ اس کی ہابی بن چکا تھا ـــــــ اپنے اخبار کے تبادلے میں وہ اردو اخبارات و رسائل اور کتابیں بھی منگوایا کرتی تھی۔

اسے ان مشاغل میں منہمک دیکھ کر ممی اکثر سوچا کرتی تھیں کہ اس عجیب و غریب شوق کا محرک لاشعور میں چھپی ہوئی ایشیائی باپ کی محبت کا شدید جذبہ ہی تو ہے ورنہ . . . . کہاں ایشیائی کلچر اور زبان اردو اور کہاں یورپ کے طوفانِ رنگ و بو کی آغوش میں پلی ہوئی ایک حسین اور نوجوان جرمن دوشیزہ ـــ!!

اور پھر اخبار کی طرف سے ایشیائی ممالک کی سیاحت کی اجازت حاصل کرنے کیلئے اپنے اخبار کے چیف ایڈیٹر اور مینجنگ ڈائریکٹر کو آمادہ کرنے میں وہ کس قدر کوشاں نظر آتی تھی ـــــــ اخبار کے خرچ پر ان ممالک کی سیاحت کا موقع حاصل کرنے کی کوشش میں اسے کتنے ہی دل انتظامیہ کے سرکردہ لوگوں کیساتھ مغز کھپانا پڑا تھا ـــــــ اور جب ایک دن اسے ایشیا کے کئی ممالک (جن میں پاکستان بھی شامل تھا) کی سیاحت کا تحریری آرڈر ملا اور اسکے چیف ایڈیٹر نے اسے بلا کر ضروری ہدایات دیتے ہوئے جلد روانہ ہو جانے کی تاکید کی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی مانو . . . . . برسوں کے سہانے خوابوں کی تعبیر آج مل گئی تھی۔!!

یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار کچھ ملا ہو۔!

چند دن کے بعد اپنے اخبار کی لیڈی فوٹوگرافر مس ہیلن کی معیت میں وہ ایشیا کی سیاحت پر نکل کھڑی ہوئی ـــــــ یہ الف لیلائی سرزمین اور یہاں کی ہر چیز اسکے لئے دامن کش دل تھی ـــــــ خوبصورت اور پراسرار ـــــــ!! ملک ملک اور نگر نگر گھومتی اور اپنے انوکھے تجربات فیچرز اور سفر نامے کی صورت میں مرتب کرتی ہوئی وہ پاکستان کے اس دور افتادہ علاقے میں آنکلی تھی۔ یہاں کے رسوم و رواج، ماحول اور مختلف علاقوں کے باشندوں کے انداز و اطوار زبانیں اور رہنے سہنے کے طریقے سبھی کچھ بے حد دلکش اور جاذب نظر تھے۔ یہ کچھ اتفاق ہی تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس خطۂ زمین پر پروگرام سے زیادہ دن لگ گئے ـــــــ ان کے یہاں پہنچتے ہی موسم جو خراب ہوا تو آمد و رفت کیلئے سڑکیں بھی بند ہوگئیں ـــــــ مجبوراً انہیں رکنا پڑا۔!!

برف باری اور بارش چند گھنٹوں کے لئے تھمتی تو کرسٹا اور ہیلن آس پاس کی بستیوں میں گھومنے پھرنے نکل جاتیں ورنہ سارا سارا دن ریسٹ ہاؤس میں آتشدان کے پاس بیٹھنے لکھنے پڑھنے اور کافی سے دل بہلانے میں گذر جاتا۔ گپوں کے ساتھ تاش کی بازی چلتی یا پھر پاکٹ سائز ٹرانسسٹر یا ٹیپ ریکارڈر پر میوزک کی دھنوں کے ساتھ رقص کر کے اپنی کلب لائف اور ڈانس کی یاد تازہ کر لی جاتی۔

ایسے لمحات میں برآمدے یا کھڑکی میں کھڑے ہو کر مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونا کرسٹا کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ کوئی اتفاقی حادثہ تھا یا قدرت کی ستم ظریفی کہ انجانے میں . . . بالکل

غیرارادی طور پر ہی کرسٹا اس مقام تک آپہنچی تھی جو درحقیقت اسکی منزل تھا۔۔۔ اس کے مشرقی باپ کی جنم بھومی ——— !! اسکی امنگوں، آرزوؤں اور ولولوں کا مرکز —— !!

کوئی نامعلوم طاقت گائیڈ کرتے ہوئے اسے اس مقام تک لے آئی تھی۔۔۔۔

اور آج وہ یہاں موجود تھی۔۔۔۔۔ اس جگہ پر بلند و بالا اور پرشکوہ برفانی پہاڑوں کے درمیان۔۔۔ اس حسین و دلکش وادی میں۔۔۔۔ جو کبھی اس کے روایات پسند پاکستانی باپ کی ملکیت تھی ——— !اس کی جاگیر — !!

آبشاروں، چشموں اور مدھر جھرنوں کی وہ سرزمین۔۔۔۔ وہ جنت ارضی جس کو برسوں سے وہ صرف خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں دیکھتی آئی تھی۔۔۔۔

لڑکپن سے جوانی تک اس کے ذہن نے اس کے ہزاروں نقشے بنائے تھے۔۔ ۔۔۔۔ یہ نقشے بنتے، بگڑتے اور پھر اس کا غیر مطمئن ذہن خوب سے خوب تر کی تلاش میں کہیں بہت دور نکل جاتا۔۔۔۔۔۔ ! تخیل کی مدد سے، وجدان کی آنکھ سے وہ بہت کچھ دیکھتی۔۔۔۔۔ محسوس کرتی اور پھر اس کا ذہن نئے سرے سے مصروف عمل ہو جاتا۔

ایک نیا نقشہ۔

نئی دنیا —— نئے لوگ

اور نیا ماحول —— !

جس کا ہیرو ہمیشہ اس کا اپنا باپ ہوتا ——— وہ باپ جو ممی کے پاس پڑی ہوئی تصویروں میں انتہائی وجیہہ، باوقار اور افسانوی شخصیت کا حامل نظر آتا تھا۔

بہادر، جفاکش اور الف لیلے کی کہانیوں کا شہزادہ ۔!!
آج ۔۔۔۔ آج وہ سچ مچ اس ماحول میں موجود تھی ـــــــ اس سرزمین پر کھڑی تھی ـــــــ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور آج یہ ہمیشہ کی طرح ایک خواب نہ تھا ـــــــ حقیقت تھی ـــــــ ایک ٹھوس حقیقت ـــــــ اور مغیرہ گل کے ساتھ زبردست مشابہت کا راز اسکی سمجھ میں آچکا تھا۔
حالات کرسٹا کو زندگی کے ایک اہم موڑ پر لے آئے تھے ـــــــ وقت کی رفتار ایک دم سے ہی بہت تیز ہو گئی تھی ـ
"اماں ۔! مجھے سب کچھ بتائیے ۔۔۔۔۔۔ مغیرہ گل کے متعلق ۔۔۔۔۔۔ اس حویلی کے متعلق اور ۔۔۔۔۔" باپ کا نام اسکی زبان تک آتے آتے رک گیا ـــــــ اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہوتے لگے جنہیں وہ بڑی خوبصورتی سے چھپا گئی ۔
کرسٹا کے دل میں جذبات واحساسات کا تلاطم برپا تھا ۔۔۔۔۔ طوفان پوشیدہ تھا ـــــــ اور اس طوفان پر قابو پانے کے لئے اسے کتنے صبر وضبط اور ہمت وکوشش سے کام لینا پڑا ـــــــ یہ پگلی بڑھیا اور ہیلین دونوں کو معلوم نہ تھا ۔
پگلی انسانیہ ماضی کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی تھی ـــــــ کرسٹا کی حقیقت سے بے خبر اپنی ہی دھن میں وہ کہے جا رہی تھی ـــ
"وہ بڑی زندہ دل تھی ۔۔۔۔۔۔ شوخ ، شریر اور نٹ کھٹ ۔۔۔ کھیل کود اور پڑھائی میں یکساں تیز ـــــــ ہر لمحے ، ہر گھڑی ایک نئی شرارت ،

بنا چٹکلہ ــــ نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا ــــ اور میں ..... جو زندگی بھر شوہر کی بے رخی، بے پروائی اور سرد مہری کا نشانہ بنی رہی اس کے لبوں سے محبت، خلوص اور سچے پیار کے دو بول سننے کو ترستی رہی۔ بیٹی کی معصوم شوخیوں میں کھو کر اپنی جذباتی محرومیوں کو بھولنے لگی تھی .... اس کی پیاری پیاری توتلی باتوں نے میرے مجازی خدا کی طرف سے ملنے والے بے حسی اور بے اعتنائی کے زخموں کو اپنا مقدر سمجھ کر میں اپنی اکلوتی بیٹی کے قریب، اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور چنچل اداؤں میں گم ہو گئی تھی۔!

مجھے مستقبل کے لئے ایک حسین سہارا اور خوبصورت کھلونا مل گیا تھا۔

اب مجھے کسی چیز کی پرواہ نہ رہی تھی۔

میں دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی اور رات کو اس نرم و نازک گڑیا کو سینے سے لپٹا کر دن بھر کی تھکن بھول جاتی ــــ مجھے اس کے کاموں اور اسے بنانے سنوارنے میں ایک عجیب سا سرور و سکون ملتا تھا ــــ اس کی بھولی بھالی صورت، معصوم ادائیں اور دل موہ لینے والی توتلی باتیں مجھے مصروف رکھنے کو کافی تھیں۔!!

اپنی ویران زندگی کی روحانی و نفسیاتی محرومیوں سے میں نے سبق سیکھ لیا تھا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کو اعلےٰ تعلیم دلواؤں گی تاکہ میرے شوہر کیطرح اس کا شوہر بھی اسے جاہل، گنوار اور جنگلی ہونے کا طعنہ نہ دے سکے۔

اپنی کم علمی اور ناخواندگی کے باعث میری بیٹی ازدواجی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں

کے ساتھ شوہر کے پیار سے محروم نہ رہے ـــــ ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ہا ۔ ۔ ۔ ۔ !!"
بوڑھی انسانیہ نے ایک طویل ٹھنڈا سانس لیا، اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں کے بھیگتے ہوئے گوشوں کو سر پہ اوڑھے ہوئے ریشمی دوپٹے کے آنچل سے پونچھا اور کرسٹا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"تم کیا جانو وہ کتنی ذہین تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی چاق و چوبند اور چست و چالاک ۔!
اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! میں نے اسکی رسم بسم اللہ کتنی دھوم دھام سے منائی تھی ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ یہ حویلی کس کس طرح سجائی تھی اور کس طرح دل کے ارمان نکالے تھے ۔!!"
بڑھیا کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شائد تصور کی آنکھوں سے آج بھی وہ اسی منظر کو دیکھ رہی تھی ـــــ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی تو اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔

"وہ سکول میں داخل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔ پڑھائی میں اتنی تیز تھی کہ ہر جماعت میں اول آتی ـــــ کھیلوں اور دوسرے مقابلوں میں تمام لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ـــــ سہیلیاں اور استانیاں سبھی تو اسے پیار کرتی تھیں ـــــ خوبصورت بھی بہت تھی نا ـــــ بالکل تمہاری طرح ـــــ !!

دسویں جماعت میں اس نے وظیفہ حاصل کیا ـــــ دسویں تک اس نے قریبی شہر کے ہائی سکول میں تعلیم پائی تھی ـــــ ہمارا پرانا اور وفادار ڈرائیور جیپ پر ہر روز اسے سکول چھوڑنے اور لینے جاتا تھا مگر اب دسویں کے بعد اسے گھر سے بہت دور ایک بڑے شہر کے کالج میں جانا تھا۔

وہاں بورڈنگ میں رہنا تھا ۔!!

"بیٹی تم خود ہی بچی ہو تمہیں کیا معلوم کہ نازوں سے پالی اکلوتی بیٹی کو اپنی آنکھوں سے دور بھیجنا ایک ماں کے لئے کتنا مشکل ہے پر ...... پر بیٹی کی خوشیوں اور اچھے مستقبل کے لئے میں نے یہ بھی برداشت کر لیا —— بس ہر قیمت پر اسے سکھی دیکھنا چاہتی تھی —— کامیاب و کامران ۔!!

وہ چلی گئی ۔

ہر ہفتے یا اتوار کو میں اسے ملنے کے لئے وہاں جاتی اور چھٹیوں میں وہ خود گھر چلی آتی ۔

اس کی آمد کا انتظار —— آنے پر ناز نخرے اور پھر جانے کی تیاری ۔!

اس کی موجودگی میں دن جو ایک سہانے خواب کیطرح پلک جھپکنے میں بیت جاتے تھے ۔

آہ ..... ہا.. ہا —— !!

اس نے دل پر ہاتھ رکھکر زور سے دبایا —— شاید دل سے اٹھتی ہوئی ٹیسیں اسطرح کچھ کم ہو جائیں ۔

"پھر جب اسکے جانے کا دن آتا میں کتنی ہی چیزیں اپنے ہاتھوں سے بنا کر اسکے ساتھ کر دیا کرتی تھی ۔ اس کے جاتے ہی میں اس سے دوبارہ ملاقات کے دن گننا شروع کر دیتی ۔ آہ ..... کیا دن تھے وہ بھی —— !

کرسٹا اور ہیلن نے دیکھا بڑھیا کی جھریوں زدہ آنکھوں سے اشکوں کی برسات جاری تھی —— ٹپ ٹپ گرتے ہوئے آنسو اسکے مرجھائے ہوئے چہرے

کوتر کر رہے تھے اور کرسٹا کو مغیرہ گل کا عکس سمجھتے ہوئے وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی آواز میں اسے بتائے جا رہی تھی۔

و دیکھتے ہی دیکھتے چار سال گذر گئے۔

بی۔اے پاس کر لینے کے بعد وہ یونیورسٹی میں داخلے کے لئے ضد کرنے لگی۔

گھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کا باپ خود اعلےٰ تعلیمافتہ ہونے ہوئے بھی قدیم خاندانی روایات کا پابند تھا اور اس قدامت پسند خاندان کی کنواریوں کے چہرے تو چاند سورج نے بھی نہیں دیکھے تھے ـــــ یونیورسٹی میں جاکر لڑکوں کے ساتھ مغیرہ گل کا پڑھنا باپ کی غیرت کے لئے کھلا چیلنج تھا اور . . . . علاقے کا سب سے بڑا خان اتنا بے غیرت کیسے بن جاتا ـــ ؟؟

اس کی بیٹی یونیورسٹی میں داخلے کے لئے دہائی مچا رہی تھی ـــــ ضد کر رہی تھی ـــــ مچل رہی تھی اور وہ اپنے بھتیجے امیر زادہ خان کے ساتھ اس کی شادی کر دینے کی سوچ رہا تھا ـــــ خاندانی رواج کے مطابق مغیرہ کی منگنی بھی پیدا ہوتے ہی اس کے چچا کے بیٹے امیر زادہ خان کے ساتھ کر دی گئی تھی اور خاندان کے بزرگوں کے خیال میں مغیرہ گل آج سے کئی سال پہلے شادی کے قابل ہو چکی تھی۔

امیر زادہ خان کی تعلیم کے لئے ہم نے بہتیری کوشش کی مگر اس نے دس جماعتوں سے آگے پڑھ کر ہی نہ دیا ـــــ دسویں میں بھی مسلسل چار سال فیل ہونے کے بعد تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔

مغیرہ کے باپ نے امیرزادہ کی اعلےٰ تعلیم کے لئے گھر میں کئی کئی استاد رکھے۔ انگریزی کالج میں اسے داخلہ دلوایا، روپیہ پانی کیطرح بہایا لیکن اس کند ذہن لڑکے کا دماغ پڑھائی میں نہ چل سکا ——— اسکی عادتیں بھی بڑی ہی عجیب وغریب تھیں ——— پتہ نہیں شہر میں کیا کرتا تھا ——— گھر سے کئی کئی ہفتے غائب رہتا۔ آتا تو ماں سے چوری چھپے روپیہ لیکر پھر چلا جاتا۔

ایک دو بار میں نے ڈرتے ڈرتے مغیرہ کے باپ کو بتانا چاہا لیکن وہ تو الٹا مجھی پر برس پڑا ——— میری تو کوئی بات وہ سنتا ہی نہ تھا۔

امیرزادہ خان اسکے مرحوم بھائی کا بیٹا تھا اور ہمارے دونوں گھروں میں اکلوتا لڑکا ——— ! کسی نے بھی میری بات نہ سنی . . . . . کوئی میری بات کو قابل توجہ سمجھتا ہی کب تھا ؟ میں تو ایک بے عقل اور ناسمجھ عورت تھی ان کی نظر میں ——— !

مغیرہ کے باپ اور دوسرے بزرگوں کے خیال میں شادی ایک بیڑی تھی . . . . ایک ایسی زنجیر جس میں بندھتے ہی امیرزادہ خان خود بخود سدھر جائے گا ——— ! کچھ تو اپنی روایات اور کچھ امیرزادہ کی تعلیمی کمی کی وجہ سے اس کا باپ مغیرہ کی مزید تعلیم کے خلاف تھا مگر وہ بھی تو بے حد ضدی تھی . . . . بالکل اپنے باپ کیطرح ——— !

کسی کی مانتی ہی نہ تھی ——— کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی . . . . . اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ ایم۔ اے کر گئی اور میں . . . . . میں ایک بدقسمت ماں جو اسکی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتی تھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات برداشت نہ کر سکی اور تب ہم دونوں ماں بیٹیوں کی ضد کے آگے اسکے

باپ کو بھی ہار ماننا پڑی۔
شادی دو سال کے لئے ملتوی کر دی گئی اور وہ پڑھنے کے لئے یونیورسٹی میں چلی گئی۔
گھر سے بہت دور —!!

پانچواں باب

بڑا فلمی قسم کا حادثہ تھا ــــ!!

آج حسب عادت تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری سے کچھ کتابیں لیکر وہ نیچے جارہی تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ زینے طے کرتا وہ اوپر لائبریری میں آرہا تھا۔ موڑ پر دونوں اچانک ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح ٹکرائے جیسے مخالف سمت سے آنے والی دو تیز رفتار گاڑیاں ــــــ سچ تو یہ ہے کہ دونوں کو دن میں تارے نظر آگئے تھے۔

"اندھے ہو کیا نظر نہیں آتا ــــــ؟" جاگیر دار کی خوبصورت بیٹی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔۔۔ یہ سوچے بغیر کہ فواد سے زیادہ قصور اس کا اپنا تھا۔

"آئی۔ ایم۔ سوری۔!" فواد کے منہ سے بے ساختہ نکلا ــــــ یہ سب کچھ ہونے پر وہ کچھ بوکھلا گیا تھا شائد ــــــ!

دوسرے لمحے وہ جھکا اور زمین پر بکھری ہوئی کتابیں، پرس اور اس سے نکل کر بکھر جانے والی چھوٹی چھوٹی چیزیں سمیٹنے میں مغیرہ کی مدد کرنے لگا۔

"ہونہہ ــــــ!!" اس کے ہاتھ سے چیزیں اور کتابیں تقریباً چھینتے ہوئے وہ برآمدے میں کھڑی سہیلیوں کے گروہ کیطرف چل دی ــــــ اندر ہی اندر کھولتی اور الجھی ہوئی سی ــ!!

"بڑا زبردست ایکسیڈنٹ تھا۔ خدا خیر کرے ــــ" ایک کلاس فیلو لڑکی کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ پاکستانی فلموں میں رومانس کا آغاز اسی طرح ہوا کرتا ہے۔ بی بنو ایک دو مرتبہ ناک منہ چڑھائیں گی، نخرے دکھائینگی اور پھر گا گا کر، ناچ ناچ کر اظہار محبت ہوگا ــــ اگلے پچھلے سارے ریکارڈ مات ہو جائینگے ــــ!"

یہ کوکب تھی ــــ ایک اور کلاس فیلو ــــ نٹ کھٹ اور بات بات پر فقرے چست کرنے والی انتہائی زندہ دل لڑکی ــــ!

" ابتدا تو ہو گئی ہے۔

ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ "

ریحانہ نے ایک چنچل مسکراہٹ کے ساتھ بڑے دوستانہ انداز میں وار کیا۔ "ویسے لڑکا برا تو نہیں۔ شریف ہے اور ذہین بھی ــــ!"

" اور غریب بھی ــــ! سوچ لو کہیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند والی بات نہ ہو جائے"۔ ایک اور آواز نے ناصح مشفق بننے کی کوشش کی۔

"کیوپڈ اندھا ہے۔ وہ غربت اور امارت کے امتیاز کو نہیں جانتا ــــ"

" اوف . . . . خدا کے لئے اس گھٹیا مذاق کو چھوڑو۔" وہ سٹپٹا گئی۔ "مجھے ایسی باتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ "

"پر میری جان۔! حقیقت کو تو فیس (Face) کرنا ہی پڑتا ہے۔" ہمیشہ گم سم اور چپ چاپ رہنے والی فوزیہ کے چہرے پر بھی دو شریر سی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ "ویسے اطمینان رکھو ہم سب کی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں ــــ "

"اللہ میاں خیر سے پروان چڑھائے ——— !" ایک اور آواز آئی ——— دعائیہ لہجے میں۔

"اف خدایا ——— ! لڑکیاں ہیں یا طوفان ——— !" مغیرہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اچھا میں تو چلی ———" جان چھڑانے کا اسکے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ بھڑوں کے اس چھتے سے نپٹنا اسکے بس کی بات نہ تھی۔

پیچھے سے کلاس فیلوز کی ہنسی اور تیکھے تیکھے ریمارکس سن کر اس کے قدم کچھ اور بھی تیز ہو گئے تھے ——— کلاس روم کو بہترین پناہ گاہ سمجھتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔

"ملکۂ کوہسار ——— ! خوش آمدید ———" ! اندر قدم رکھتے ہی ایک لاابالی امیرزادے اعجاز نے دبی زبان میں فقرہ چست کرتے ہوئے خیر مقدم کیا اور جلی بھنی مغیرہ کا جی چاہا کہ وہ کرسی اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارے ———

کلاس شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے ——— وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"کوئین آف بیوٹی ——— ! Queen of beauty !" اعجاز کا ساتھی سلمان بظاہر اپنے دوست سے مخاطب تھا۔

مغیرہ کی شعلہ بار نگاہیں سلمان کیطرف اٹھیں اور دوسرے لمحے وہ کچھ اور بھی نروس ہو گئی۔ سامنے بلیک بورڈ پر کسی من چلے نے چاک سے لکھ رکھا تھا۔

جس مصوّر کا بھی شاہکار ہو تم
اس نے برسوں تمہیں سوچا ہو گا

"اوہ . . . . . . یہ سارے لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ .

یونیورسٹی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔" اس ساری مصیبت سے بچنے کے لئے اس نے کتاب میں پناہ ڈھونڈنی چاہی۔ وہ خواہ مخواہ ورق الٹتی جا رہی تھی۔

"یار۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔؟" پروفیسر کو آتے دیکھ کر ایک لڑکے نے جلدی جلدی بلیک بورڈ صاف کر دیا لیکن اسکے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ یہ سمجھانے کے لئے کافی تھی کہ مجرم خود ہی ناصح مشفق بننے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ اس کی اس کمینگی پر۔! مغیرہ کو معلوم نہیں لیکچر کہاں سے شروع ہوا اور کہاں پر ختم ـــــ اس کا ذہن کچھ عجیب گڈمڈ سا ہو رہا تھا۔ کلاس فیلو لڑکیوں کے تیکھے تیکھے جملے، چھبتی ہوئی سی مسکراہٹیں، معنی خیز نگاہیں . . . . اور پھر اعجاز اور سلمان کے ریمارکس ـــــ!!

"ملکہ کوہسار ـــــ! کوئین آف بیوٹی ـــــ!"

"بڑا زبردست ایکسیڈنٹ تھا۔ خدا خیر کرے۔!"

"کوئی بات نہیں آجکل کے رومانس کی ابتدا ایسے ہی ہوا کرتی ہے۔"

اس کا دماغ سن سا ہو کر رہ گیا۔ ہاتھ نوٹ بک پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے میں مصروف رہے۔ مخلوط تعلیمی ماحول کا یہ پہلا تجربہ کچھ خوشگوار نہ تھا۔

"مس مغیرہ۔! Any question?" پروفیسر کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

"جی۔؟" گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ اسکے چہرے سے عیاں تھی۔ بڑی واضح اور نمایاں ـــــ!! سبھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ نے لیکچر توجہ سے نہیں سنا۔؟" پروفیسر نے پوچھا۔ "Any question ?"

"Every thing is clear sir۔!" اعجاز کی آواز اور باقی سٹوڈنٹس کا قہقہہ

سن کر سارے جسم کا خون سمٹ کر اسکے چہرے کی طرف آگیا تھا شاید کیونکہ اسے اپنے رخسار اور کان جلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"آتش گل۔!" قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک سٹوڈنٹ نے دبی آواز میں کہا۔

بظاہر وہ نظریں اپنی نوٹ بک پر جمائے محو مطالعہ نظر آتا تھا۔

"مغیرہ پر دل خان۔!"

"یس سر۔!" بمشکل اسکے منہ سے نکل سکا۔

"آپ نے لیکچر توجہ سے نہیں سنا۔ ویسے بھی کلاسز لیٹ اٹینڈ Attend کرنے کے باعث آپ کے نوٹس نامکمل ہیں۔ مسٹر فواد ہماری کلاس کے سب سے زیادہ ذہین اور ہونہار سٹوڈنٹ ہیں۔ انکے نوٹس میں نے دیکھے ہیں۔ بڑی محنت سے تیار کئے گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ بھی ان سے لیکر اپنے نوٹس مکمل کر لیں کیونکہ اگزامینیشن پوائنٹ آف ویو (Examination point of view) سے آجکل کے لیکچرز بے حد اہم ہیں۔ ان موضوعات سے متعلقہ کتابیں بھی مارکیٹ میں نایاب ہیں۔ لائبریری میں ایک آدھ کاپی ہے جو کہیں مہینوں میں جاکر ہاتھ لگتی ہے اور وہ بھی صرف ایک دو روز کے لئے۔ اس لئے آپ اس کا انتظار نہ کریں۔ مسٹر فواد۔!

She is a brilient student Please help her

مغیرہ نے نیلی نیلی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر بوکھلاہٹ کے ایک نئے حملے کا شکار ہو گئی۔

"یا اللہ۔!"

تھوڑی دیر پہلے سیڑھیوں پر اسکے ساتھ ٹکرا جانے والا لڑکا پروفیسر کے قریب کھڑا تھا۔

"جی بہت اچھا۔" اس نے مغیرہ کیطرف دیکھا اور ایک دلکش سی مسکراہٹ اسکے سنجیدہ چہرے پر پھیل گئی۔

کلاس فیلوز کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں سن کر وہ جلدی جلدی نوٹ بک پر ہاتھ چلانے لگی — بلاوجہ — بے مقصد لکیریں کھینچتی رہی - اس کا سرخ و سفید چہرہ اور کانوں کی لویں جل رہی تھیں۔

اگلی صبح وہ پہلے پیریڈ کے بعد یونیورسٹی لان میں کھڑی ایک کلاس فیلو لڑکی کیساتھ باتیں کر رہی تھی کہ فواد نے نوٹس لا کر پکڑا دیئے — اس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور شوخ و شنگ مسکراہٹ دیکھ کر جانے کیوں مغیرہ کے دل کی دھڑکنیں خود بخود تیز ہو گئیں۔ "تھینکیو —" اس نے نظر جھکائے جھکائے ایک محجوب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "دو تین روز میں لوٹا دوں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ جب بھی آپ آسانی سے اتارلیں۔" وہ بدستور مسکرائے جا رہا تھا — گہری اور پراسرار سی مسکراہٹ —!!

اور اگلے دن فواد نے پھر بات کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیا — مغیرہ اس کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے آپ ہی آپ گلنار ہو رہی تھی اور . . . . . اس کے تمتماتے ہوئے رخساروں کی تازگی و شادابی دیکھکر فواد کچھ محسوس کر رہا تھا — کوئی خوبصورت سی تشبیہہ اسکے ذہن میں نہ آرہی تھی کہ شعر و نغمہ اور خوابوں کی سرزمین کی صحت بخش

اور مہکی ہوئی ہواؤں کی پروردہ یہ شوخ و شنگ پہاڑی دوشیزہ خود سراپا شعر تھی ۔۔ !
کسی شاعر کا تخیل ۔۔۔ ! کسی مصور کا لافانی شاہکار ۔۔۔ !!
فواد نے اپنے دل میں خوشگوار سی دھڑکنیں بیدار ہوتی ہوئی محسوس کیں ۔ زندگی میں پہلی بار ۔۔۔ ! کائنات مسکرا اٹھی تھی اور ہر طرف گیت ہی گیت بکھر گئے تھے ۔ سہانے میٹھے اور زندگی سے بھرپور گیت ۔۔۔ ! ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آرہی تھی . . .
اور زندگی ایک دم سے ہی بے حد حسین اور کیف آگیں معلوم ہونے لگی تھی ۔۔۔
اپنی تمام تر تلخیوں کے باوجود ۔۔۔ !!
تمام رات فواد کو نیند نہ آئی ۔ وہ سوچتا رہا ۔ جانے کیا کیا ۔ !
مغیرہ اسکے دل و دماغ پر قبضہ جما رہی تھی ۔ فواد جاگتے میں سہانے سپنے دیکھ رہا تھا ۔ ان سپنوں میں مغیرہ کا ہاتھ اسکے ہاتھ میں تھا ۔ وہ قریب تھی ۔ دل کی دھڑکنوں سے بھی زیادہ ۔۔۔ !!

پرسوں کے ٹیسٹ کے لئے آپ یہ کتاب ضرور پڑھ لیں ۔ بہت کام دیگی ۔"
اگلے دن وہ ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں کھڑا مغیرہ سے مخاطب تھا "میں نے اسکی تلاش میں شہر بھر کی لائبریریوں کے چکر لگائے ہیں ۔ پبلک لائبریری ، برٹش کونسل ، یو ۔ ایس ۔ ایس ۔ آر اور یو ایس ۔ اے ۔"
"آپ نے پڑھ لی ۔ ؟"
"ہاں اور آپ کے نوٹس بھی تیار کر لئے ۔ فیئر (Fair) کر کے کل لا دوں گا ۔"

جذبات سے بوجھل لہجے میں ایک عجیب والہانہ پن تھا۔
فواد کی بیقرار نگاہوں کا پیغام پاتے ہی مغیرہ کے چہرے پر جو شفق پھوٹی تو لہریں سارے چہرے پر پھیل کر اسے بالکل بیر بہوٹی بنا گئیں۔

فواد مسکرایا۔ ایک غرور بھری مردانہ مسکراہٹ۔!! فاتحانہ انداز میں۔!
آج وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ فضا کی بیکراں وسعتوں میں پرواز کر رہا تھا۔ اونچا۔ بہت اونچا۔! انجام سے بے پروا...... اور مستقبل سے بے نیاز۔!!
ہر پل، ہر لمحہ اور ہر گھڑی وہ اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اسے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ کسی مقناطیس کی طرح۔! اسے پاگل کئے دے رہی تھی اور وہ...... مدہوش ہو رہا تھا...... بن پیئے۔!

"مس مغیرہ۔! آپ میں ہیموگلوبین کی مقدار ضرورت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"
ایک دن فواد کی کسی بات پر اسے گلاب کی طرح کھلتے دیکھ کر اسکے کلاس فیلو اعجاز نے فقرہ کسا۔ اس کی آواز میں حسد، جلن اور طنز کا بڑا عجیب سا امتزاج تھا۔!!
جملے کی گہرائی اور تلخی کو سمجھنے کے باوجود مغیرہ اور فواد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دیں۔

چھٹا باب

یونیورسٹی میں کھیلوں کے سالانہ مقابلے تھے۔ ٹینس کے میچ میں مغیرہ اور فواد پارٹنرز تھے۔!

اعجاز نے بھی مغیرہ سے پارٹنر شپ کے لئے پوچھا تھا مگر اس کی طرف سے نفی میں جواب ملنے پر وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

اور اب وہ اپنے گروہ کے ساتھ دونوں کے مخالف کھیل رہا تھا۔ مقابلہ سخت یوں بھی تھا کہ کھیل معمولی تفریحی مقابلے کی حد سے نکل کر اب ان کے ذاتی غرور وانا کا مسئلہ بن گیا تھا ـــ فواد اعجاز کی ذہنیت کو خوب سمجھتا تھا اور اس کے مقابلے میں اپنی شکست تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہ تھا۔

مغیرہ گل کا قرب اسکے لئے ایک مضبوط سہارا تھا۔ ... اور اس حسین سہارے کی موجودگی میں وہ اعجاز تو کیا دنیا بھر سے ٹکر لینے کو تیار تھا۔

کھیل جاری رہا۔

مقابلہ سخت تھا اور کھلاڑی اپنے فن میں ماہر ـــ!!

تماشائی نتیجے کے منتظر تھے۔ اور کھلاڑی اپنے اپنے وقار کو بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی حسب منشا نتائج حاصل کرنے کے خواہش مند ـــ!

مغیرہ کا ساتھ فواد کی رگوں میں زندگی کا خون بن کر دوڑ رہا تھا ... ۔ اعجاز اینڈ کمپنی

کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ دونوں جیت رہے تھے ـــــ وہ جیت گئے ۔!!
مبارکباد کے جملوں، پرجوش تالیوں اور نعروں کی گونج میں فاتحانہ انداز میں چلتے، ہنستے مسکراتے ہوئے وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کیطرف آگئے ۔

مغیرہ اور فواد کو دوستوں کے ہجوم میں چہکتے دیکھ کر اعجاز کا احساس شکست کچھ اور بھی شدید ہوگیا ۔

" اونہہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ۔" اعجاز کے زہر بھرے لہجے میں حسد، رقابت اور نفرت وحقارت کے سمندر موجزن تھے ۔

مغیرہ کو فواد کے ساتھ دیکھکر وہ ہمیشہ آپے سے باہر ہوجایا کرتا تھا ـــ شاید اپنی دولت وثروت اور سماجی مرتبے کے غرور اور احساس برتری کی وجہ سے وہ خود کو سب سے زیادہ مغیرہ کا حق دار اور اس کے پیار کا مستحق سمجھتا تھا ــــ ! ایک ضدی اور لاڈلا امیر زادہ کوئی بات اپنی خواہش کیخلاف برداشت کرنے کا عادی نہ تھا ۔
آج تک اس نے جس چیز کی خواہش کی اسے حاصل کر کے چھوڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ مغرور لڑکی مغیرہ گل تو اسے ذرا بھی لفٹ نہ دے رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے سطحی اور چھچھورے مزاج کا آدمی سمجھتے ہوئے اس سے اخلاقاً بات کرنے کی بھی روادار نہ تھی ۔ اور وہ ۔ ۔ ۔ جو اپنی ساری کوششیں کر کے ہار گیا تھا ۔ ۔ ۔ تھک گیا تھا ۔ ۔ ۔ مغیرہ اور فواد کو ایک دوسرے کے قریب دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ کسی زخمی ناگ کیطرح بل کھا رہا تھا ۔!!

" بڑا ہیرو بنا پھرتا ہے سالا ـــ دیکھ لیں گے ۔" اس نے فواد اور مغیرہ کی طرف دیکھ کر ہونٹ کاٹتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا ۔

مغیرہ نے آج کے کھیل میں فواد کے ساتھ مل کر اسے شکست دی تھی۔ اسکی انا کو مجروح کیا تھا۔۔۔ اور دولت و ثروت کے ساتھ اسکے سماجی مرتبے کو چیلنج بھی۔!!

اور پھر کس غرور اور فاتحانہ شان کے ساتھ مسکراتی اور ریکیٹ گھماتی وہ فواد کے ساتھ چلی گئی تھی — اسے نظر انداز کر کے۔۔۔۔۔ اسکی طرف دیکھے بغیر۔۔۔! اور اعجاز یوں چپ چاپ شکست تسلیم کرنیوالوں میں سے نہ تھا۔

"All is Fair in war and Love — ! آل از فیئر ان وار اینڈ لو"

یہ اس کا ایمان تھا۔

"یار۔! یوں چھپکے چھپکے پوجا کرنے سے فائدہ۔؟؟ کسی دن اظہار محبت کر کے تو دیکھو۔!" اگلے دن ٹک شاپ پر بیٹھے بیٹھے سلمان نے چائے کی چسکیوں کے درمیان اعجاز کو مشورہ دیا۔

"مگر موقع بھی تو ملے نا۔ ! وہ مجنوں کی اولاد تو ہر وقت اس کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ کیا مجال جو ایک منٹ کے لئے بھی اسے اکیلا چھوڑ دے۔" اعجاز پہلے ہی جھلایا ہوا تھا سلمان کی بات پر اور بھی چڑ گیا۔

سلمان ہنس پڑا۔ ایک بیساختہ ہنسی۔!!

"موقع ملتا نہیں میری جان پیدا کیا جاتا ہے پر اسکے لئے تھوڑی سی جرأت و ہمت چاہیئے جس کی تم میں ہمیشہ سے کمی ہے۔"

"جرأت وہمت ۔؟ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ وہ ہوسٹل جانے کیلئے ٹیکسی سٹینڈ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی اور کئی لڑکیاں بھی اسکے ساتھ تھیں ۔ میں نے دیکھا تو اپنی کار میں پہنچا آنے کی آفر کی لیکن اس نے بڑی ڈپلومیٹک مسکراہٹ کے ساتھ "تھینکیو" کہہ کر انکار کر دیا۔ اب تم ہی سوچو میری پوزیشن کتنی آکورڈ ہو گئی تھی اتنی لڑکیوں کے سامنے ۔ یقین کرو سبھی ہنس رہی تھیں ۔ اس کے بعد میں ایک منٹ بھی وہاں نہ ٹھہر سکا۔ چند قدم دور آ کر میں نے لڑکیوں کا قہقہہ بھی سنا تھا۔ وہ سبھی میرا مذاق اڑا رہی تھیں ۔"

یار ۔! تم رہے نرے گھامڑ کے گھامڑ ۔! بہر حال تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ ... پر نہیں پہلے پکچر کا وعدہ کرو ۔" سلمان نے اعجاز کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چلو وعدہ رہا لیکن خیال رہے کہ لڑکی کافی روڈ (Rude) ہے۔

"تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا اب چلوں آج مجھے ذرا کینٹ تک جانا ہے" سلمان اٹھ کر کھڑا ہو گیا " او۔ کے ۔ ٹاٹا ۔!!

"ٹاٹا ۔!" اعجاز نے بھی ہاتھ ہلایا اور سلمان سکوٹر پر بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔

یہ دسمبر کی ایک چمکیلی صبح تھی ۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس کے طلباء وطالبات یونیورسٹی کے وسیع وعریض لانز میں ٹولیوں کی شکل میں کھڑے سنہری دھوپ کی خوشگوار سی حدت کا لطف اٹھا رہے تھے ۔

کہیں کورس کی کتابوں اور مختلف موضوعات پر گفتگو جاری تھی اور کہیں دسمبر ٹیسٹ موضوع بحث ۔!! بعض منچلے دسمبر ٹیسٹ کو گول کرنے کے بہانے سوچ رہے تھے اور کچھ سنجیدہ قسم کے طلباء وطالبات اہم امتحانی سوالات پر آپس میں تبادلہ خیالات میں مصروف

نظر آتے تھے۔

لان کے ایک کونے میں پڑے ہوئے بنچ پر مغیرہ گل دھوپ میں بیٹھی مطالعے کے ساتھ ساتھ فواد کا انتظار کر رہی تھی۔ خلاف معمول آج وہ ابھی تک یونیورسٹی نہ پہنچا تھا۔ اسکی عدم موجودگی میں پہلے پیریڈ کے نوٹس مغیرہ نے بڑی توجہ سے لئے تھے تاکہ بعد میں فواد کو یہ موضوع تیار کرتے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔ دونوں ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے اور قدم قدم پہ ایک دوسرے کے مددگار۔!!

"مس مغیرہ گل۔! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہمیں آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" آج مغیرہ کو تنہا پاکر اعجاز نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

"فرمایئے۔!" لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی اور کتاب بند کر دی۔

خلاف توقع مغیرہ کے ہونٹوں پر ایک کشادہ سی مسکراہٹ دیکھ کر اعجاز اور سلمان کے حوصلے بڑھ گئے ایک دوسرے کی آنکھ کا اشارہ پاکر وہ قریب ہی بچھے ہوئے دوسرے بنچ پر بیٹھ گئے۔ اعجاز نے کھنگار کر گلا صاف کیا۔

"مس مغیرہ۔! آپ کے ہمدرد اور خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے ...... ہم۔" اور اعجاز رک گیا۔

"ہاں ہاں کہیئے۔! آپ رک کیوں گئے۔؟" مغیرہ نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ فواد جیسے تھرڈ کلاس لڑکے کے ساتھ اتنے گہرے تعلقات رکھنا آپ جیسی عالی ظرف لڑکی کے شایان شان نہیں۔ بحیثیت کلاس فیلو معمولی سی راہ ورسم تو ٹھیک ہے مگر دوستانہ تعلقات تو اپنی سطح کے لوگوں سے ہی قائم کیئے جاتے ہیں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ فواد ایک معمولی سے کلرک کا بیٹا ہے اور اپنے گیارہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑا۔!

سکول اور کالج میں فیس معاف کروا کر وہ یونیورسٹی تک پہنچا ہے۔اس کے سکالرشپ کی رقم تو اسکی دائمی مریض ماں کی دواؤں پر ہی اٹھ جاتی ہے۔اپنے اخراجات کیلئے وہ دو تین جگہوں پر ٹیوشن پڑھاتا ہے۔پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ روپے پر۔ بھلا وہ آپ جیسی رئیس زادی کی نازبرداریاں کیسے کرسکتا ہے۔؟ اس جیسے بھوکے ننگے کے لئے تو آپ کا ایک دن کا خرچ اٹھانا بھی مشکل ہے۔ دراصل وہ صرف آپ کی دولت کی وجہ سے آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ایسے مفلس و قلاش لوگ ہمیشہ رئیس زادیوں کے سہارے اپنی ساکھ بنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔"

اعجاز نے آج ہمت کر کے ہفتوں کی رٹی رٹائی تقریر دہرادی۔ آج مغیرہ کے سامنے وہ اچھی طرح اپنے دل کا غبار نکالنا چاہتا تھا۔ کیا پتہ پھر موقع ملے نہ ملے۔

"ہمارے اعجاز صاحب شہر کے مشہور و معروف بیرسٹر کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اوپر سے ماشاءاللہ اتنے بڑے زمیندار بھی۔!! ماڈل ٹاؤن میں ان کی کئی کنال میں پھیلی ہوئی کوٹھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اتنی عالیشان کوٹھی، یہ لمبی چوڑی نئی شیورلیٹ، قیمتی اور ماڈرن سامان۔!!"

سلمان نے ایک روایتی چمچے کی طرح اعجاز کی وکالت شروع کر دی۔ مغیرہ کو متاثر کرنیکا یہی ایک طریقہ اس کے دماغ میں آیا تھا۔

"آپ ماشاءاللہ حسن وصحت، ذہانت اور خاندانی عظمت و وقار سبھی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ آپ کے لئے بھلا شایان شان ساتھیوں کی کیا کمی۔؟؟؟"

اعجاز نے خوشامد بھرے لہجے میں مزید گل افشانی کی۔ فواد کے خلاف زہر اگل کر آج وہ دل کے سارے ارمان نکال لینے پر تلا ہوا تھا اور پھر کیا معلوم..... تیر نشانے پر لگ ہی جائے۔!!

اور مغیرہ گل..... وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی.... اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اعجاز اور سلمان کا منہ نوچ لے.... انہیں دھکے دے کر وہاں سے نکال دے۔ وہ فواد کی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

"تھینک یو مسٹر اعجاز۔ لیکن ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ کو میرا ایڈوائزر کس نے مقرر کیا ہے؟" بڑی طنز اور حقارت تھی اسکے اس مختصر سے جملے میں۔ "میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔

"مگر..... مگر سنیئے تو۔!!" سلمان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئیں۔"

"بس، بس نو مور کمنٹس۔!!" اور مغیرہ کے لہجے کی واضع ڈانٹ کے بعد سلمان کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

"خیر آپ کی مرضی..... لیکن یاد رکھیئے کہ کسی روز آپ پچھتائیں گی۔" یہ اعجاز تھا۔ لہجے میں احساس شکست تھا اور دھمکی بھی۔!! اور مغیرہ گل..... وہ ضدی اور نڈر لڑکی اعجاز کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے بھی ذرا نہ گھبرائی تھی۔ اس نے اعجاز کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ نتائج کا اندازہ کئے بغیر۔!!

یونیورسٹی یونین کے انتخابات کی آمد آمد تھی۔ فواد اور اعجاز میدان عشق و محبت میں ایک دوسرے کے رقیب و حریف.... ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع بھی تو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے..... مغیرہ سے جھاڑ کھانے اور محبت کی بازی میں فواد کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد اعجاز کی حالت کسی زخمی بھیڑیئے سے کم نہ تھی۔ اخلاق و شرافت اور تہذیب و شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر وہ فواد کو ہر قیمت پر شکست دینے اور اپنی مجروح انا کو تسکین پہنچانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ کلاس ہو یا کھیل کا میدان۔ محفل ہو یا تنہائی وہ فواد کی توہین و تذلیل کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا۔ اور یہ محض فواد کی فطری شرافت اور امن پسندی تھی کہ بار ہا ایسے مواقع آجانے کے باوجود نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتے پہنچتے رہ گئی تھی۔

اب ایک مرتبہ پھر دونوں حریف میدان میں آگئے تھے۔ دونوں پریذیڈنٹ کے عہدے کے لئے امیدوار تھے۔

مقابلہ سخت تھا اور کنویسنگ زوروں پر۔۔۔!!

اعجاز کا حامی گروپ فواد کو شکست دینے کے لئے سازشوں اور دعوتوں پر ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔۔!!

تصنع۔۔۔

بناوٹ اور ظاہری ٹھاٹ باٹھ۔۔۔۔!!

اعجاز نے اپنی دولت و ثروت کا مظاہرہ قدم قدم پر کیا۔... اور روپیہ پانی کیطرح بہایا۔

دوسری طرف فواد تھا... ایک غریب طالب علم... جس کے پاس ذاتی

صلاحیتوں، ذہانت اور خوش اخلاقی کے علاوہ کوئی اور دنیاوی متاع نہ تھی۔
اعجاز کو یقین تھا کہ اس مرتبہ وہ ضرور فواد کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا..
... یہی وجہ تھی کہ اس کے دوست اور ساتھی کامیابی کے بعد ابھی سے لمبی چوڑی دعوتوں، پارٹیوں اور جشنوں کے پروگرام بنا رہے تھے۔
طالبات کی طرف سے مغیرہ بلا مقابلہ سیکرٹری منتخب ہو چکی تھی اور اس کی کنویسنگ کی وجہ سے لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں کی بھاری تعداد نے بھی فواد کے حق میں ووٹ ڈالنے کا وعدہ کر لیا تھا۔
یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس کا جوش و خروش اور گہما گہمی قابلِ دید تھی۔ سبھی اپنے اپنے امیدواروں کے حق میں کنویسنگ میں مصروف تھے۔
تقریریں ____
پوسٹرز ____
پمفلٹ ____
بینرز اور سپورٹرز کی کمیونیکیشن ۔!! سبھی ہتھیار استعمال کئے جا رہے تھے۔ پولنگ کا دن آیا۔
ووٹ ڈالے گئے۔ !!
دونوں فریق ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اب نتائج کے منتظر تھے۔
ایک طرف ذاتی کردار اور ذاتی صلاحیتیں تھیں اور دوسری طرف روپہلے سکوں کی جھنکار اور سماجی مرتبے کا غرور ___ مقابلہ واقعی سخت تھا۔!!

بند کمرے میں ووٹوں کی گنتی ہوتی رہی اور دونوں امیدواروں کے حامی دھرنا مارے کمرے سے باہر بیٹھے وقتاً فوقتاً نعرے لگاتے رہے۔

نتائج کے اعلان میں ابھی کچھ وقت تھا۔ امیدواروں کا اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔

تھوڑی دیر اور گذر گئی۔

اور پھر بھاری اکثریت کے ساتھ فواد کے صدر یونین منتخب ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

اعجاز کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ نتیجہ اسکی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو مارے صدمے کے اس کے دل و دماغ مفلوج سے ہوکر رہ گئے۔ اس کے حق میں گنتی کے چند ووٹ ہی پڑے تھے۔ وہ بھی صرف اس کے چھوٹے سے گروپ کے ــــ ایسی ذلت آمیز شکست کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

فواد کے ساتھیوں نے مارے خوشی کے اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔!

"فواد ــــ زندہ باد۔!

صدر یونین ــــ ! زندہ باد۔!"

جلوس میں شامل سٹوڈنٹس اپنی روائتی زندہ دلی کا دل کھول کر مظاہرہ کر رہے تھے۔ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ کود رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے . . . اور بھنگڑا ڈال رہے تھے۔

فواد کے حامیوں کے نعرے اور جشن مسرت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اعجاز کے دل میں فواد کے خلاف نفرت کا بیج تناور درخت کی شکل اختیار کرتا گیا۔!

فواد کی کامیابی پر مغیرہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ قدم رکھتی کہیں اور پڑتے کہیں تھے۔ اپنی سہیلیوں اور جان پہچان والی طالبات کے ہجوم میں گھری وہ مبارکبادیں وصول کر رہی تھی۔ فواد کی کامیابی اس کی کامیابی تھی اور اپنی اس فتح پر وہ بجا طور پر نازاں تھی۔!!

آج یونیورسٹی لان میں یونین کے حلف وفاداری اٹھانے کی تقریب کے سلسلے میں ایک شاندار ٹی پارٹی دی گئی تھی۔ پرتکلف چائے کے بعد میوزک اور ورائٹی شو کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ مرکزی وزیر تعلیم مہمان خصوصی تھے۔
اپنے حامی گروپ اور اساتذہ کے علاوہ ایک اچھے سپورٹس مین کی سپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے فواد اور مغیرہ نے اعجاز اور اس کے ساتھیوں کو بھی مدعو کیا تھا مگر۔۔۔
اعجاز اس "رقیب روسیاہ" کے جشن کامیابی میں شریک ہونے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔!

"اعجاز اور سلمان وغیرہ نہیں آئے۔؟" چائے پر فواد نے مغیرہ سے پوچھا
"نہیں۔ حالانکہ میں نے خود انہیں انویٹیشن کارڈز دیئے تھے۔" مغیرہ نے جواب دیا۔ "کس قدر بری بات ہے۔ انسان کو اتنا کم ظرف بھی نہیں ہونا چاہیئے۔" ایک اور کلاس فیلو نے اظہار خیال کیا۔ "زندگی کے کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔" اور اس نے چائے کی پیالی منہ سے لگالی۔ "انہیں شامل ضرور ہونا چاہیئے تھا۔"

ظرف ہے نا اپنا اپنا۔!" یہ شاہد تھا۔ ایک اور کلاس فیلو۔

مائک پر اناؤنسر نے ورائٹی پروگرام شروع ہونے کا اعلان کر دیا۔ سب اپنی اپنی سیٹوں کی طرف لپکے۔

مختلف قسم کے چھوٹے موٹے آئیٹم پیش کئے گئے۔ مشرقی پاکستان کی ایک بنگالی طالبہ کا لوک گیت بے حد پسند کیا گیا۔ سریلی آواز میں پدما کی لہروں کا سا مدوجزر اور بہتے ہوئے پانیوں کی روانی تھی۔!! مشرقی پاکستان کے مخصوص لباس میں اس نے کلاسیکل ڈانس پیش کیا تو ہال میں دیر تک تالیوں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ اس کے بعد فواد سے فرمائش ہوئی۔ وہ غزلیں بے حد خوبصورت گاتا تھا نا۔ اکثر فرمائش کر کے خالی پیریڈز میں کلاس فیلوز اسے سنا کرتے تھے۔ اور آج بھی دوستوں کے اصرار پر اسے سٹیج پر آنا ہی پڑا۔ تالیوں کی گونج نے استقبال کیا۔

وائلن کے مدہم سروں کے ساتھ ایک خوبصورت سی غزل کا آغاز ہوا۔

یہ مدہم سر دھیرے دھیرے بلند ہوتے گئے۔

آواز کا زیر و بم ——

سوز و درد ۔۔۔۔۔ اور

نغمے کا سحر ——!!

سننے والے مسحور ہو گئے۔ بار بار فرمائش ہوتی رہی۔!!

لوگ غلط تو نہیں کہتے کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔" مغیرہ نے سکون و سرور کی ایک عجیب سی لہر اپنے رگ و پے میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ اس کا ہیرو ۔۔۔۔۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ واقعی جان محفل تھا۔ وہ دل ہی دل میں نازاں تھی اپنے اس

انتخاب پر۔

غزل ختم ہوئی۔ حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔"

"ارے بھئی فواد۔ ! تم تو واقعی چھپے رستم نکلے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اتنا اچھا گاتے ہو۔" کافی دیر کے بعد جب تالیوں کی گونج کم ہوئی تو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اسے داد دی۔

"تھینکیو سر۔!" فواد ذرا سا جھک کر مسکرایا۔

اناؤنسر دوسرے آئیٹم کا اعلان کر چکا تھا لیکن فواد نے کچھ ایسا سماں باندھا تھا کہ

ع پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

محفل کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر اعجاز اور اس کے ساتھی ہجوم سے دور روشوں پر ادھر ادھر گھومتے ہوئے فواد، مغیرہ اور ان کے ساتھیوں پر ریمارکس پاس کر رہے تھے۔ جلے کٹے جملے۔ اور

زہر میں بجھا ہوا لہجہ ——!!

دوسری طرف پروگرام جاری تھا۔ حسب معمول قہقہے بلند ہو رہے تھے اور یونیورسٹی سٹوڈنٹس اپنی روایتی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ساتواں باب

یہ اتوار کی ایک خوبصورت سی رومینٹک دوپہر تھی جب شہر کے ہنگاموں سے دور، دریا کے کنارے ایک خوبصورت سے جھنڈ میں بیٹھے وہ ایک دوسرے سے محو رازونیاز تھے۔

دریا کی بل کھاتی ہوئی لہریں رواں دواں تھیں۔ ایک ان دیکھی اور انجانی منزل کیطرف...! اتوار کی چھٹی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی من چلے اور زندہ دل نوجوان پکنک، مچھلی کے شکار اور بوٹنگ کے موڈ میں دریا کے کنارے ڈیرے لگائے ہوئے تھے۔

لدی لدائی کشتیاں دریا کے سینے پر آجارہی تھیں۔ بڑی ہی سبک رفتاری کے ساتھ...! کشتیوں میں لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ٹرانسسٹرز کی ریڈیائی لہروں پر سریلے گیت پھیل کر فضا کو سحر آلود اور نغمہ بار بنانے کا حق ادا کر رہے تھے اور دریا کے اس پار . . . . . سب لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر وہ ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ایک دوسرے کی ذات میں گم تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ——! زندگی اور زندگی کے آلام و مصائب سے بے پروا —— دو دیوانے اپنے حال میں مست تھے کہ ان کی دنیا مکمل ہو چکی تھی۔

"آپ کی کامیابی پر میری طرف سے تحفہ۔!" مغیرہ نے ایک خاصی مہنگی اور نایاب کتاب فواد کو پیش کی "اور آپ کو گھڑی کی ضرورت بھی تو تھی۔ یہ لیجئے۔ خالی کلائی اچھی

نہیں لگتی ۔" ایک دلنشیں اور کافرانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فواد کا ہاتھ پکڑا اور کلائی پر رسٹ واچ باندھنے لگی ۔

"اوہ . . . . نہیں مغیرہ ۔" فواد نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی ۔

"لیکن کیوں ۔ ؟"

"اوہ میری جان ۔!" اسکی آواز حلق میں پھنسنے لگی ۔ "مجھے اتنا زیر بار تو نہ کرو کہ میں تمہارے سامنے سر بھی نہ اٹھا سکوں ۔"

"مگر آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں ۔ ؟"

"اس لئے کہ اگر میں تمہارے احسانات کا بدلہ اتارنے کے قابل ہوتا تو مجھے تم سے اتنے قیمتی تحائف قبول کرنے میں کوئی عذر نہ تھا لیکن . . . لیکن میں تو ایک نادار طالب علم ہوں . . . . ایک معمولی سے کلرک کا بیٹا . . . . جسے یونیورسٹی ٹائم کے بعد اپنی تعلیم کے اخراجات اور بوڑھے باپ کا بوجھ بٹانے کے لئے پارٹ ٹائم کام کرنا پڑتا ہے . . . . تاکہ اس کے دس گیارہ بھائی بہنوں اور بوڑھے والدین کو دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی اور تن ڈھانپنے کو موٹا جھوٹا کپڑا میسر آسکے ۔" اس کی آواز میں بے پناہ دکھ تھا اور چہرے پر درد وکرب کی لہریں پھیل گئی تھیں ۔ وہ ایک دم سے ہی بجھ سا گیا تھا ۔

"فواد ۔!" مغیرہ کی آواز گھٹ کر رہ گئی اور نیلی آنکھیں چھلک پڑیں ۔

"مغیرہ ۔ ! میری جان، میری زندگی ۔ ! کاش میں اس قابل ہوتا کہ تمہاری زندگی بھر کی رفاقت کے لئے تمہارے سرمایہ دار باپ کے سامنے جھولی پھیلا سکتا مگر اب . . . . اب ۔ ؟" شدت جذبات سے اس کے گلے میں پھندے سے پڑنے لگے ۔ چند منٹ خاموش رہ کر وہ بولا ۔

"آئندہ میں تم سے دور رہنے کی کوشش کروں گا۔ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ہمیں اپنے حالات کو دیکھنا چاہیئے۔ اپنے اپنے مقام کو پہچاننا چاہیئے۔ آج کے بعد ہم اسطرح تنہائیوں میں نہیں ملیں گے۔ اعجاز ٹھیک ہی تو کہتا ہے بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند...
.... کیسے لگ سکتا ہے۔؟؟؟"

"لیکن کیوں۔؟ آخر تم میں کمی کیا ہے۔؟؟ مغیرہ نے بے چین ہو کر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ فواد کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ ضدی لڑکی تو ہر پسندیدہ چیز کو حاصل کر لینے کی عادی تھی۔ زندگی نام ہے شکستہ دلی، محرومیوں اور مایوسیوں کا۔ یہ اسے معلوم نہ تھا۔ ایک جاگیردار کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی زندگی کے ٹھوس اور تلخ حقائق سے ابھی آشنا نہ ہوئی تھی جبکہ قدم قدم پر حقائق کی سنگین چٹانوں سے ٹکر لیکر محض اپنے مضبوط بازوؤں کے سہارے آگے بڑھنے والا فواد آنکھیں بند کر کے چلنے کا عادی نہ تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھتا تھا۔ جانچتا اور پرکھتا تھا۔ ایک حقیقت پسند محنتی نوجوان کیطرح۔!

"میرا سب سے بڑا عیب تو یہ ہے کہ میں ایک غریب طالبعلم ہوں۔ ایک نادار شخص کا بیٹا۔ جس کے دامن میں مستقبل کے خوش آئند خوابوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ سہانے خواب دیکھتا ہے اس ضدی اور معصوم بچے کیطرح..... جو آکاش پر جگمگانے والے چاند کی روشنی اور حسن دیکھ کر اسے اپنے بازؤں میں بھر لینے کے لئے مچل اٹھتا ہے.....
میری روح! تم بھی میری زندگی کے آسمان پر جگمگاتا ہوا وہ روشن چاند ہو جس کی صرف خواہش کی جا سکتی ہے۔ من مندر کی دیوی ہو۔ عظیم اور ناقابل حصول۔ جس کی صرف پوجا ہی کی جا سکتی ہے۔!"

"لیکن.... فواد۔! ہم اس خواب کو حقیقت بھی تو بنا سکتے ہیں۔" مغیرہ کے لہجے

میں امید تھی۔ رجائیت اور عزم۔!!

"نہیں مغیرہ۔! مجھے جھوٹی آس مت دلاؤ۔ میں کسی خود فریبی کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔ آس ٹوٹ جانے کے بعد زندگی کا یہ طویل سفر میرے لئے بے حد کٹھن ہو جائے گا اور ..... پھر شائد میں پاگل ہو جاؤں گا ..... زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

"نہیں تمہیں اپنا اندازِ فکر بدلنا ہوگا۔ ہم دونوں یہ سفر ہنستے کھیلتے طے کریں گے۔ میں ایک ایک قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔ تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گی۔!"

بڑی خود اعتمادی تھی اس کے لہجے میں۔

"پگلی۔!" فواد نے پیار سے اسکے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میری زندگی میں کانٹے ہیں پھول نہیں۔ ناز و نعم اور آرام و آسائش کا عادی یہ کومل سا جسم زندگی کے خارزاروں کے زخم برداشت نہیں کر پائے گا۔ میری محبوب۔! تم ایک بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی ہو اور میں ..... میں ایک مفلس کے گھر کا چراغ۔ جو سات بہنوں کیلئے جہیز اور کھاتے پیتے گھرانے تلاش کرتا کرتا بوڑھا ہو جائے گا" وفورِ جذبات سے فواد کا چہرہ کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو رہا تھا۔

"فواد۔ میرے دوست۔! ہم دونوں مل کر یہ بوجھ اٹھائیں گے۔ امارت و غربت کا یہ امتیاز میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں جانتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر بھی خوش رہوں گی۔ اس لئے کہ میں تمہاری ہوں۔ صرف تمہاری۔!!"

"مگر تمہارے والد۔ ؟؟؟" ہزاروں اندیشے اور وسوسے تھے اس ایک مختصر سے جملے میں۔ "وہ یہ سب کیسے برداشت کریں گے۔؟"

"تم فکر نہ کرو۔۔ انہیں منالوں گی۔ وہ اعلےٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ یورپ میں گھومے پھرے ہیں۔ اتنے دقیانوسی تو نہیں ہونا چاہیئے ان کو۔!"

اور تب سکون و مسرت کی ایک زبردست لہر نے فواد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے کیوپڈ دیوتا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ تمام مصلحتوں اور عقل و ہوش کو بالائے طاق رکھ کر۔!!

"مغیرہ۔! تم سچ مچ دیوی ہو۔!" فواد نے وفور مسرت سے بے قابو ہو کر اس کے ہاتھ تھام لئے "کیا سچ مچ میں اتنا خوش قسمت ہوں۔؟!" ایک عالم بیقراری میں وہ بار بار پوچھے جا رہا تھا۔

"میری روح۔! مجھے یقین نہیں آتا۔ مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں" وہ اسکے ہاتھوں کو دیوانہ وار چوم رہا تھا۔ آنکھوں سے لگا رہا تھا اور اس لمحے اس کی وارفتگی و بیخودی جنوں کی حدوں کو چھو رہی تھی۔

"میری محبوب۔! اگر اب تم نے مجھے چھوڑ دیا یا ٹھکرا دیا تو میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔۔ خودکشی کر لوں گا۔!"

"ہش۔۔۔۔" مغیرہ نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا" ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔" ایک ساحرانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی مخمور نگاہوں سے فواد کو دیکھا اور پھر۔۔۔۔۔ اس کا سر فواد کے سینے پر آن ٹکا۔ وہ مدہوش ہو چکی تھی۔۔۔ ۔۔۔بن پیئے۔!!!

اور۔۔۔۔ ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر خار دار جھاڑیوں اور خودرو پودوں کے گھنے جھاڑ میں چھپے اعجاز کا ہاتھ کھٹا کھٹ کیمرے کا بٹن دبائے جا رہا تھا۔

یونیورسٹی میں ڈیبیٹ تھی۔!!

اس ڈیبیٹ میں مغربی پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں سے مقررین مدعو کئے گئے تھے۔ بحیثیت صدر و سیکرٹری فواد اور مغیرہ انتظام میں پیش پیش تھے۔ مغیرہ سٹیج سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دے رہی تھی۔ اور موضوع زیر بحث تھا۔

"صحت مند معاشرے کی تعمیر میں دانشور اہم کردار ادا کرتے ہیں۔"

فواد موضوع کے حق میں اور اعجاز اس کی مخالف میں بول رہا تھا۔ دونوں رقیب دلائل و براہین کے خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ایک مرتبہ پھر میدان میں آ گئے تھے اور اعجاز نے حسب معمول اس دفعہ پھر ایک خالص علمی مباحثے کو اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا ڈالا تھا۔!!

گذشتہ شکستوں کا داغ مٹانے کے لئے اس نے اس مرتبہ زبردست تیاری کی تھی اور اس کی تقریر کی تیاری میں ملک کے دو تین بلند پایہ ادیبوں کی کوششیں بھی شامل تھیں۔

قائد حزب موافق اور قائد حزب مخالف کی تقریروں کے بعد باقاعدہ مباحثے کا آغاز ہوا۔ دو تین مقررین سٹیج پر آئے اور اپنے اپنے دلائل پیش کر کے واپس اپنی نشستوں پہ جا بیٹھے۔

فواد نے مائک سنبھالا۔

پروگرام کے مطابق اعجاز پارٹی نے زبردست ہوٹنگ، تالیوں اور طنزیہ جملوں سے استقبال کیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ ابتدا میں ہی اسے پریشان کر کے سٹیج چھوڑ دینے پر مجبور کر دینا چاہتے تھے لیکن . . . . . .

وہ بڑے صبر و سکون کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا یہ طوفان بدتمیزی تھمنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شور و غل اور تالیاں تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ مجبوراً صاحب صدر کو اٹھ کر مداخلت کرنی پڑی۔ ایک مختصر سی تقریر کے ذریعے حاضرین کو ان کے فرائض، ایوان کے وقار اور تہذیب و شائستگی کے تقاضوں کا احساس دلانا پڑا۔

فواد نے بڑے پر سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ آہستہ آہستہ اسکی آواز بلند ہوتی گئی اور پھر . . . اپنے ٹھوس دلائل، ساحرانہ انداز بیان اور خود اعتمادی کے سہارے وہ ایوان پر چھا گیا۔ اس کی بظاہر پر سکون شخصیت اسوقت کسی ایسے سمندر سے مشابہ تھی جس کی تہہ میں ہزاروں ہنگامے کروٹیں لے رہے ہوں۔

اعجاز اینڈ کمپنی نے ایک مرتبہ پھر ہنگامہ برپا کر کے اس کو پاؤں سے اکھاڑنا چاہا، مگر ان کی آواز فواد کے مداحین کی تالیوں اور تحسین و آفرین کے نعروں میں دب کر رہ گئی۔

کھیل بگڑ گیا۔ بالکل غیر متوقع طور پر۔!!

اعجاز نے اس دفعہ بھی منہ کی کھائی کہ جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق فواد فرسٹ پرائز کی ٹرافی لے گیا تھا۔

اعجاز اور اس کے ساتھی ججوں کے اس فیصلے کے خلاف بطور احتجاج واک آؤٹ کر گئے۔

وہ ہال سے باہر جمع ہو کر نعرے لگا رہے تھے۔

"ہمیں یہ فیصلہ منظور نہیں۔"

"ججوں نے جانبداری سے کام لیا ہے۔!"

"اپنا فیصلہ واپس لو۔!"

"قواد۔ مردہ باد۔"

"یونیورسٹی یونین۔ مردہ باد۔!"

اس تازہ چوٹ کے بعد ان کے درمیان نفرت کی دیوار کچھ اور بھی اونچی ہو گئی۔! فاصلے بڑھتے گئے ..... اور اس کے ساتھ ہی اعجاز کا جذبۂ انتقام بھی۔!!

آٹھواں باب

ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایک تفریحی ٹور کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ تفریح کے ساتھ ساتھ چند تاریخی مقامات کا سروے بھی مکمل کر لیا جائے گا۔

سٹوڈنٹ لائف کے یہ حسین و دلکش ٹرپ ماضی کی سہانی و ناقابل فراموش یادوں میں تبدیل ہو کر مستقبل کی کٹھن راہوں پر چلنے والے تھکے ہارے مسافروں کے لئے سرمایۂ تسکین و راحت بن جایا کرتے ہیں اور پریکٹیکل لائف کی ذمہ داریوں و تلخیوں میں بے فکری کے یہ نٹ کھٹ لمحے سرمایۂ حیات۔!!

اپنے اس ٹور کو یادگار بنانے اور ان ساعتوں کو دوام بخشنے کے لئے طلباء و طالبات ابھی سے ٹیپ ریکارڈروں، کیمروں اور ٹرانسسٹروں کے انتظام میں مصروف تھے۔

مغرہ اور فواد اپنے دوستوں کے گروہ کے روح رواں تھے۔ اور بے حد خوش۔!! ایک دوسرے کی موجودگی اور گہرے دوستوں کی کمپنی نے اس ٹرپ کا ایک ایک لمحہ ان کے لئے یادگار بنا دیا تھا۔ اپنے تعلیمی سروے کے ساتھ ساتھ وہ ان خوش کن ساعتوں کے سحر سے دل بھر کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تاریخی مقامات اور کھنڈرات میں ایک نئی زندگی اور حسن و رعنائی دیکھ رہے تھے۔

یہ دنیائے رنگ و بو۔

مسحور کر دینے والے مناظر فطرت اور

محبوب کا قرب۔!!

زندگی میں اسکے علاوہ اور چاہیئے بھی کیا۔؟

کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیوں کی معیت میں وہ کشتی کی سیر کے لئے نکلے۔ کشتی پرسکون لہروں کے سینے پر بڑی سبک رفتاری کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اور وہ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔!!

لطیفے۔

نقلیں۔

قہقہے۔

ہنسی مذاق۔ ۔ ۔ ۔ اور

ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ۔!!

"خواتین حضرات۔! توجہ فرمایئے۔ اب آپ میڈم مغیرہ گل سے ایک پہاڑی لوک گیت سنیئے۔ فرمائش کرتے ہیں کراچی سے مسٹر فلاں۔ ۔ ۔ ۔ لاہور سے مس فلاں۔ ۔ ۔ ۔!!"

کوکب کو جانے کیا سوجھی کہ بیٹھے بٹھائے اعلان کر دیا اور مغیرہ گل جو دریا کی لہروں میں ہاتھ ڈالے ان سے کھیل رہی تھی ایک دم چونک پڑی۔

"یس۔ گڈ آئیڈیا۔!" بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔ "چلو مغیرہ۔!"

"کہاں۔؟" اس نے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ گردن گھمائی۔

"اتنا بنتی کیوں ہو۔؟ گانا سناؤ۔!"

"مگر میں۔ ۔ ۔ ۔!"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" ایک اور آواز نے اصرار کیا "بس اللہ کا نام لیکر شروع ہو جاؤ۔"

"چلو بھئی جلدی شروع کرو۔ بہانے یا نخرے قطعاً نہیں چلیں گے۔ نغمی نے مغیرہ کا

کندھا پکڑ کر ہلایا اور بولی "بس اب ریکارڈ آن ہو جانا چاہیئے۔"

"گانا۔ !گانا۔ !"

اچھے بھلے یونیورسٹی سٹوڈنٹس کورس میں شروع ہو گئے تھے۔ مغیرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بھڑوں کے اس چھتے سے کس طرح جان چھڑائے۔ جب کئی طرح کے حیلوں بہانوں کے باوجود کوئی راہ فرار نظر نہ آئی تو فواد کی تجویز پر مغیرہ نے ایک پشتو گیت سنایا۔

آواز کی نغمگی اور چنچل پن کے علاوہ گانا تو کسی کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ ہاں ترنم کو سبھی نے سراہا تھا۔

"اب ہماری فرمائش پر ایک گانا اردو کا بھی ہو جائے تاکہ کچھ معنی تو پلے پڑیں۔" دوسرے کنارے پر پہنچ کر سب نے خواہش ظاہر کی۔

"فواد اور مغیرہ دونوں مل کر گائیں گے۔" کوکب کو ہمیشہ نرالی باتیں سوجھا کرتی تھیں۔

"اوہ . . . . ونڈرفل۔ !شاباش، کوکب تم ہمیشہ دور کی کوڑی لاتی ہو۔ چلو فواد ہو جائے ایک ڈیوٹ۔ !" ندیم نے کوکب کی تائید کی۔

"نہیں یار پہلے کچھ کھلاؤ پلاؤ بھی نا۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے اور اتنا گھوم پھر کر مارے بھوک کے انتڑیاں قل ہو واللہ پڑھ رہی ہیں۔"

ہاں بھائی پہلے کھانا پھر کچھ اور . . . . بھوک بہت زوروں پر ہے۔" فواد نے ہاشم کی طرف دیکھا جو کھانے پینے کے انتظامات کا ذمہ دار تھا۔

"ہاشم یار۔ !تم کیسے وزیر خوراک ہو۔ یہاں جنتا بھوکی مر رہی ہے اور تمہیں گانے بجانے کی فکر پڑی ہے۔ یاد رکھو اگر ہمارے پیٹ کا دوزخ بھرنے کا انتظام نہ ہوا تو پارلیمنٹ میں تمہارے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش کیا جائے گا۔"

"اور اس کا مسودہ میں تیار کروں گا۔" ایک اور آواز آئی۔

مرے کیوں جاتے ہو۔؟ ذرا صبر سے کام لو۔ کھانا ضرور ملے گا۔ مگر ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر۔ اس لئے کہ آج کے سفر کی منزل وہی ہے۔" ہاشم نے سامنے درختوں کے جھنڈ میں چھپے ہوئے ریسٹ ہاؤس کیطرف اشارہ کیا۔" ہم سے بہت پہلے رمضو بابا کھانے کا سامان لیکر وہاں پہنچ چکا ہے بھوکی جنتا کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔ کہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔"

" اچھا چلو۔ ریسٹ ہاؤس کونسا دور ہے۔" لیفٹ رائٹ۔ لیفٹ رائٹ کرتے وہ مارچ کر رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کے لان میں طرح طرح کے خوش رنگ پھولوں سے آراستہ ایک خوبصورت قطعہ میں گھاس پر دری بچھاکر رمضو بابا نے دسترخوان سجا رکھا تھا اور کچن میں کھانا گرم کر کے وہ ان سب کا انتظار کر رہا تھا۔ باقی لوگ پہلے ہی آچکے تھے۔

" رمضو بابا۔ زندہ باد۔!!" اتنی کوئیک سروس دیکھ کر سب نے رمضو بابا کو خراج تحسین پیش کرنے کی خاطر نعرہ لگایا۔" رمضو بابا۔ زندہ باد"

مرغ کا سالن —

پلاؤ —

شامی کباب اور نان۔!!

لطیفوں، قہقہوں اور مذاحیہ جملوں کے ساتھ کھانا ختم ہوا۔ سویٹ ڈش کا کام فروٹ سے لیا گیا اور کھانے کے تھوڑی دیر بعد چائے کا دور چلا۔ چائے پی کر تازہ دم ہوئے تو کسی من چلے نے پھر فواد اور مغیرہ سے ڈیوٹ کی فرمائش کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ فرمائشوں پر فرمائشیں۔ سبھی یک زبان ہو گئے تھے۔

رسمی انکار اور تھوڑے سے تذبذب کے بعد دونوں نے اکثریت کے فیصلے کے سامنے

سرِ تسلیم خم کر دیا کہ "جمہوریت کے اس دور" میں اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔
جن سٹوڈنٹس کے پاس ٹیپ ریکارڈر تھے وہ ان خوشگوار اور زندگی سے بھرپور لمحوں کو سرمایۂ حیات سمجھ کر یہ سارا پروگرام، لطیفے، گانے اور گپ شپ ریکارڈ کرتے جا رہے تھے۔

مغیرہ اور فواد کا گانا بھی ریکارڈ ہو چکا تھا۔
کچھ دیر بعد ایک گروپ تاش کھیلنے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ لوگ ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر گھومنے پھرنے نکل گئے اور جو آرام کے موڈ میں تھے وہ وہیں گھاس پر بچھی ہوئی دری پر نیم دراز ہو گئے۔
کچھ لڑکیاں اپنے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آس پاس گھوم رہی تھیں اور باقی ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں بچھے ہوئے پلنگوں اور قالین پر محوِ استراحت تھیں۔
اور ۔ ۔ ۔ ۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت کی پشت پر ۔ ۔ ۔ ۔ گھنے درختوں کے پیچھے ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ دنیا اور دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر دو دیوانے محوِ راز و نیاز تھے۔
فواد اور مغیرہ گل ۔!!
دونوں بیٹھے مستقبل کی پلاننگ کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ جب فواد امتحان سے فارغ ہو کر سی۔ ایس۔ پی کرنے کے بعد ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اچھی ملازمت کے ساتھ ہی اسے حکومت کی طرف سے ایک خوبصورت سا بنگلہ اور کار بھی مل جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ تب وہ اپنا ایک پیارا سا گھر بنائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ اسے سنواریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ سجائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی پسند اور اپنے ذوق کے مطابق ۔!!
تب زندگی کتنی حسین ہو گی ۔ بالکل کسی شاعر کا خواب ۔!!

"ہم گھر کے لان میں یہ والے پھول بھی لگائیں گے۔" مغیرہ نے مخملیں پھولوں کے ایک شاداب تختے کیطرف اشارہ کیا۔" فواد۔! دیکھو توکس قدر خوبصورت لگ رہا ہے یہ منظر۔!"

فواد جو اس رومان پرور ماحول کے سحر سے مکمل طور پر مسحور ہو چکا تھا بولا۔

"ہوں . . . . مغیرہ۔! مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ گھنا جنگل، یہ سرو اور یوکلپٹس کے لمبے لمبے درخت . . . . شبنم سے دھلے ہوئے پھولوں کی یہ خوشنما روشیں . . . . مہکتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں اور دریا کا کنارہ . . . . سب کچھ تمہارے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ صرف تمہارے لئے۔!!"

مغیرہ کو خاموش پاکر چند لمحوں بعد وہ پھر بولا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں ان مناظر کا تمام سحر، حسن اور شعر و نغمگی سب بیکار نظر آتے ہیں۔ بالکل ورتھ لیس۔ ہے نا۔؟؟" وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ مغیرہ کے کندھوں پر تھے اور گرم گرم سانس اس کے چہرے کو چھو رہا تھا۔

مغیرہ نے آہستگی سے اس کے ہاتھ ہٹا دیئے۔ وہ بالکل گلنار ہو رہی تھی۔ متمدن شہروں کی صنعتی زندگی کے ملگجے دھوئیں سے اٹے ہوئے ماحول میں پلنے والے اس شہری نوجوان نے کسی نوعمر دوشیزہ کے چہرے پر یہ تازگی، یہ شادابی اور یہ چمک دمک بھلا کاہے کو دیکھی تھی۔! وہ پاگل ہو رہا تھا اور مغیرہ . . . . وہ الہڑ، پہاڑی حسینہ بھی تو زندگی میں پہلی بار ان عجیب و غریب جذبات و احساسات سے دوچار ہوئی تھی۔

فواد نے قریبی پودے کی نازک سی شاخ پر جھومتا ہوا ایک خوش رنگ شگوفہ توڑا اور مغیرہ کے بالوں میں لگاتا ہوا بولا۔

" کوہسار کی عظیم دیوی " راکاپوشی " کے حضور میں ایک پجاری کا نذرانۂ محبت و عقیدت -!!"

" راکاپوشی - ؟" مغیرہ نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔" وہ کیا بلا ہے - ؟ آج پہلی مرتبہ نام سن رہی ہوں - بڑا عجیب سا ہے - راکاپوشی - ؟"

" ہاں راکاپوشی - بڑی زبردست چیز ہے - گلگت اور ہنزہ کی مقامی لوک کہانیوں کے مطابق خوش قسمتی کی دیوی راکاپوشی گلگت کے بلند و بالا برفپوش پہاڑوں کی چوٹیوں میں سے کسی ایک پر رہتی ہے اور سال میں صرف ایک بار کسی - بہت ہی مبارک لمحے میں کسی کسی خوش نصیب کو اس کے درشن ہوتے ہیں اور وہ بھی بالکل اچانک - صرف چند لمحوں کے لئے ایک جھلک دیکھنی نصیب ہوتی ہے -

دراصل بات یہ ہے کہ پہاڑ کی وہ انتہائی دلکش چوٹی سارا سال برف اور بادلوں سے ڈھکی رہتی ہے - کبھی کبھار اچانک بادل چھٹتے ہیں تو کوئی میرے جیسا خوش قسمت آدمی یہ حسین منظر دیکھنے میں اتفاقاً کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر . . . . بڑے فخر اور غرور کے ساتھ اپنے ساتھیوں اور جاننے والوں کو اپنے انوکھے تجربے کی مبالغہ آمیز کہانی سناتا ہے - سادہ لوح پہاڑی باشندے اس کے مقدر پر رشک کرتے ہیں اور پھر سارا سال خود بھی ایسے موقع کے منتظر رہتے ہیں - خوش بختی کی اس " عظیم دیوی " کے درشن کرنے کے لئے - سمجھیں مائی ڈیئر راکاپوشی - "!!

وہ مغیرہ کے بالوں کی لٹ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا - بڑی ہی شریر اور نٹ کھٹ مسکراہٹ تھی فواد کی چمکیلی آنکھوں میں - !

" اونہہ . . . . ہٹیے - باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے - " وہ بڑی ادا سے مسکرائی -

غرور اور ناز بھری شرمیلی مسکراہٹ ۔ جسے دیکھ کر اکثر فواد اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جایا کرتا تھا

"سچ مذاق نہیں۔ یقین جانو میں نے خود ایک دفعہ گلگت میں راکاپوشی کے درشن کئے تھے۔" وہ اس کے سنہری بالوں کی لمبی چوٹی کو ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے بولا۔ معیزہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مبادا اس کے کلاس فیلوز میں سے کوئی گھومتا گھامتا ادھر نکل آئے۔

"اوہو۔ کیا کرتے ہیں آپ..... ؟ ذرا ٹھیک سے فاصلے پر بیٹھیں نا۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے سکینڈل کھڑا ہو جائے گا۔ اگر ایسی حرکت کرتے ہوئے آپ کو کسی نے دیکھ لیا تو اعجاز پارٹی جینا دوبھر کر دیگی۔" فواد کی یہ وارفتگی دیکھ کر وہ گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔

لیکن اس کے خدشات سے بے نیاز ان باتوں پر توجہ دیئے بغیر وہ کہے جا رہا تھا۔

"آج سے کوئی دو سال پہلے میں ماموں کے ساتھ گلگت گیا تھا۔ وہ آرمی میں میجر ہیں اور چند ہفتوں کے لئے وہ کسی مشن پر گلگت گئے تھے۔ فیملی کو تو وہ اپنے ساتھ لیجا نہیں سکتے تھے کہ ان کا کیمپ ایک جنگل میں لگا ہوا تھا۔ ہاں میرے کالج میں چھٹیاں تھیں۔ جانے سے قبل وہ آئے اور مجھے اصرار کر کے ساتھ لے گئے۔ ان کا اصل کام صرف چند روز کا تھا۔ اس کے بعد انہیں فرصت ہی فرصت تھی۔ ماموں کو شکار کا بے حد شوق ہے۔ اکثر ہم شکار کی تلاش میں دور دور تک نکل جاتے تھے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں دن بھر مارے مارے پھرتے اور شام تک اچھا خاصا شکار لیکر واپس اپنے ڈیرے پر چلے آتے۔

ایک روز شکار کا پروگرام جو بنا تو ہم نے رات وہیں بسر کرنے کا ارادہ کر کے اپنے ساتھ جیپ میں ایک خیمہ، آئل سٹو اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھی رکھ لیں۔ چائے کا سامان بھی ساتھ تھا۔ دن بھر شکار کی تلاش میں پھرتے رہے اور شام کو تھک ہار کر پہاڑ کے دامن میں ایک جھکتی ہوئی تنگ سی وادی میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ایک آبشار کے کنارے۔!!

ادھر ادھر سے لکڑیاں جمع کر کے شکار بھونا۔ چائے پی اور کھانے کے بعد تھک ٹوٹ کر خیمے میں پڑتے ہی گہری نیند آگئی۔

رات کوئی دو بجے کا عمل ہو گا کہ کسی کے پاؤں کی مدھم چاپ سے میری آنکھ کھل گئی۔ ماموں کا پٹھان اردلی موسےٰ خان خیمے میں داخل ہوا۔ خیمے کے اندر جلنے والی آگ کی دھندلی روشنی میں مجھے جاگتے پا کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ماموں کا پاؤں پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔

"اٹھیئے صاحب۔!"

ماموں جاگ اُٹھے۔ موسیٰ خان نے انہیں خاموشی کے ساتھ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رات کا وقت . . . . . چاروں طرف ہو کا عالم اور اس پر موسیٰ خان کی پراسرار حرکتیں . . . . .!! کسی آنے والے خطرے کے احساس کے پیش نظر میرا دل دھڑکنے لگا لیکن ماموں ٹھہرے فوجی آدمی . . . . . ہر خطرے کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ کیساتھ نپٹنے کے عادی۔! یوں بھی موسےٰ خان مدتوں سے ان کے ساتھ تھا اور انہیں اسکی وفاداری پر مکمل اعتماد۔!

ماموں جان اٹھے، گن ہاتھوں میں لی، پستول میرے ہاتھ میں تھمایا اور ہم دونوں موسےٰ خان

کے پیچھے پیچھے خیمے سے باہر نکل آئے
ہم نے دیکھا۔
فلک بوس برفانی پہاڑوں سے گھری ہوئی اس سرسبز و شاداب وادی کا حسن چودھویں رات کے چاند کی روشنی میں کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ رات کے سناٹے میں چیڑ، چنار اور یوکلپٹس کے درختوں کی رومینٹک سرسراہٹ پر کسی مدہوش کن نغمے کا گمان ہوتا تھا۔
.... اور مدھر جھرنوں اور آبشاروں کی روح پرور موسیقی دل کے تاروں سے کھیل رہی تھی۔ جادو جگا رہی تھی۔!
فضا میں مسحور و بیخود کر دینے والی باس رچی بسی تھی اور اس چاند رات کے وجد آفریں سکوت میں فطرت اپنی ساری رنگینیوں، رعنائیوں، حشر سامانیوں اور سحر آفرینیوں کیساتھ بے نقاب تھی۔!!
موسیٰ خان ایک مقام پر پہنچ کر رک گیا۔
راکاپوشی کے دامن میں۔!!
"صاحب۔! دیوی راکاپوشی کا ظہور۔!" اس کی آواز میں عقیدت و احترام کے انتہائی جذبات کی وجہ سے ایک لرزش سی تھی۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور خود مؤدب کھڑا ہو گیا۔
موسیٰ خان کے اشارے پر ہماری نظریں اوپر اٹھیں اور پھر...... اوہ۔!
مغیرہ میری جان۔! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہاں ہم نے کیا دیکھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ قدرت کو اپنے سب سے انوکھے.... نرالے اور مدہوش کر دینے والے روپ میں۔
بے حجاب —— اور

بے نقاب — !!

سال کے بارہ مہینے دھند اور سیاہ بادلوں سے ڈھکی رہنے والی اس باجبروت چوٹی پر سے بادل اور دھند چھٹ چکی تھی۔

بے پناہ حسن وجاذبیت —

رعنائی ودلکشی — اور

شکوہ وعظمت — !!

کیا کچھ نہ تھا وہاں —؟ دنیا کی کوئی بھی زبان اس ماحول کے سحر ونغمہ اور جلال وجمال کی کیفیتوں کو صحیح معنوں میں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ روح کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھنے والی سکون وسرور کی ایک عجیب سی لہر نے میری پوری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

آج بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جذب ومستی کی اس کیفیت کو کون سا نام دوں۔ ! بس یہ سمجھ لو کہ روحانی سرور وسکون اور پاکیزگی وتقدس کی اس مدہوش کن فضا میں ہم تینوں بت بنے کھڑے تھے۔

پلک جھپکے بغیر —

ایک عجیب سے والہانہ انداز میں بس ایک ہی سمت کو دیکھے جا رہے تھے —

گردوپیش سے بے نیاز — مست وبے خود — !!

اور پھر ہم نے اس حسین ودلفریب چوٹی سے رنگ ونور کی شعاعیں سی پھوٹتی ہوئی محسوس کیں ...... جیسے

خلدِ بریں کا کوئی منظر . . . یا

زندگی ہاحسن وجمال اور رنگ و نور سے مرکب صبح ازل کا کوئی بھولا بھٹکا لمحہ ـــــ!!
غرض جو کچھ بھی تھا، صرف چند لمحات کے لئے . . . . کہ اس کے فوراً بعد ہی راکاپوشی نے پھر سے دھند اور بادلوں کا گہرا نقاب اوڑھ لیا تھا۔ چوٹی چھپ گئی تھی ـــ ڈھک گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی روح کو بالیدگی بخشنے والا وہ جانفزا منظر بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ فردوسی لمحہ دبے پاؤں نکل گیا تھا۔ بڑی ہی برق رفتاری کے ساتھ۔!!
سو مغیرہ گل۔! مائی ڈارلنگ راکاپوشی۔! مجھے بتاؤ کہ محبت و سرور سے سرشار ان متنوع اور بوقلموں لمحات کو میں کیا نام دوں ؟ کن الفاظ میں پکاروں۔؟ کس کس انداز میں تمہاری پوجا کروں۔؟ تمہیں دل کے کون سے گوشے میں چھپا لوں۔؟ کہیں دور لے جاؤں ـــ دنیا اور اس کے ہنگاموں سے بہت دور۔ جہاں صرف میں ہوں اور تم ـــ تم اور میں۔!!
کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیوں نہ تمہیں لے جا کر قطب شمالی کی برفوں میں کہیں دفن کر دوں جہاں میرے علاوہ تمہیں کوئی نہ دیکھ سکے ـــ کوئی نہ پا سکے۔"
وہ کہے جا رہا تھا۔ ایک عالم بے خودی میں . . . . اور مغیرہ گل . . . . وہ تو کہیں دور پہنچ چکی تھی۔ بہت دور ـــ جہاں صرف وہ تھی اور فواد ـــ اس کے سپنوں کا شہزادہ۔ اس کے دل و دماغ اور روح کی پرواز کا مرکز۔!!
"مغیرہ۔! میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم زندگی کے کسی مقام پر مجھے تنہا نہیں چھوڑو گی۔"
اس کے ہاتھ کی مخروطی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے وہ ایک عجیب عالم سرشاری میں بولے چلا جا رہا تھا۔
"جانے کیوں تمہیں اپنے اتنے قریب پا کر کبھی کبھی مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک ہونے

لگتا ہے اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ طرح طرح کے وہم اور اندیشے مجھے گھیر لیتے ہیں۔ پریشان کر دیتے ہیں۔

اکثر سوچتا ہوں کہ تمہارے والدین۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ میرا اور تمہارا ساتھ بھلا کیسے گوارہ کریں گے۔؟؟ یہ سونے اور چاندی کی دیواریں جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہیں ان کو دیکھتے ہوئے خوش فہمیوں میں مبتلا رہنا ٹھوس حقائق سے آنکھیں بند کر لینا ہی تو ہے۔ یہ سب کیسے ہو گا۔؟ کیسے۔؟؟"

"اوہو۔ ۔ ۔ !تم قنوطی آدمی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیشہ زندگی کے تاریک پہلو ہی دیکھتے ہو۔ مایوسی اور ناامیدی کے اس جال سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہاری ہوں۔ صرف تمہاری۔! مجھ پر اعتماد کرو۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ بس تم ہمت نہ ہارو۔!"

اور فواد نے مغیرہ کو کھینچ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے ہونٹ اس کے ریشمی بالوں پر ٹکے ہوئے تھے۔! اس نے پیار کیا۔ مغیرہ کی سفید سفید گردن کے پچھلے حصے پر۔! دور سے قہقہوں کی کھنک نزدیک آ رہی تھی۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ مغیرہ جلدی جلدی اپنے بال ٹھیک کرنے لگی۔

"اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو جھاڑ کے ان کانٹوں سے بچنا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔" سٹوڈنٹس کے ایک گروہ کو ادھر آتے دیکھ کر وہ جلدی جلدی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی فواد بھی۔!

ٹرپ کا دوسرا دن تھا کہ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا اور بچنے کی ہزار کوشش کے باوجود اعجاز اور فواد ایک دوسرے سے اُلجھ پڑے ۔ وہ تو کہیئے کہ چند سمجھدار اور معاملہ فہم قسم کے مخلص کلاس فیلوز نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ . . . . فواد کے تیور دیکھکر تو پتہ چلتا تھا کہ ساری مصلحتوں اور دور اندیشیوں کو بالائے طاق رکھ کر آج وہ اعجاز کو جان سے مار ڈالے گا۔

مغیرہ گل شروع سے ہی اعجاز کو بُری طرح نظر انداز کرتی آئی تھی ۔ اعجاز نے قریب آنے کی ہزار کوشش کی مگر وہ دور سے دور تر ہوتی چلی گئی۔

اعجاز کا رویہ دیکھتے ہوئے وہ اخلاقاً اور رسماً بھی اس سے بات کرنے کی روادار نہ تھی اور اعجاز . . . . وہ شکست تسلیم کر لینے والوں میں سے نہ تھا ۔ وہ تو کھلم کھلا اور اعلانیہ کہتا تھا کہ وہ مغیرہ کو حاصل کر کے رہے گا اور یہ کہ مغیرہ کی یہ نفرت و بیگانگی وقتی اور عارضی ہے وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس بیزاری کی وجہ فواد ہے ۔ صرف فواد ۔ ! اس کا حریف ۔ اسکا رقیب ۔ بھوکا ننگا اور مفلس و قلاش فواد ۔ !!

اور مغیرہ جو شروع دن سے ہی قدم قدم پر اعجاز کو دھتکارتی آئی تھی ۔ اس " بھوکے ننگے ،، فواد کی سب سے بڑی سپورٹر تھی ۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مغیرہ کی تائید و حمایت اور محبت و رفاقت کے مضبوط سہارے کے بغیر فواد یوں سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

بقول سلمان ۔ " اسکی حقیقت ہی کیا ہے ۔ "

یہ تو مغیرہ گل تھی ۔ جو اسکی زندگی میں یقین ، اعتماد ، کامیابیوں اور کامرانیوں کی روشنی بن کر داخل ہوئی تھی ۔ محبت ، خلوص اور وفا کے دیپ جلائے اس کی زندگی کی تاریک راہوں

کو منور کر رہی تھی۔

اس کی رگوں میں زندگی کا خون بن کر دوڑ رہی تھی۔

اس حقیر ذرے کو آفتاب بنانے کے لئے کوشاں تھی۔

اور فواد . . . . . اسی مضبوط سہارے کے بل بوتے پر اعجاز کے سامنے ہر قدم پر

فاتح کے روپ میں آیا تھا۔!

اس کے غرور وانا کو پاؤں کے نیچے روندتا ہوا۔

خود اعتمادانہ شان کے ساتھ ہنستا اور مسکراتا ہوا۔

اپنی تقدیر پہ نازاں ـــــ اور

کامیابی وکامرانی کے نشے میں سرشار ـــ!!

اعجاز کھول رہا تھا اپنی اس شکست پر ـــ اپنی انا کے مجروح ہونے پر۔!

یونیورسٹی میں تو وقت جیسے تیسے گذر رہا مگر . . . . اس تڑپ پر . . . . ہر گھڑی . . .

. . . ہر لمحے اور ہر پل فواد اور مغیرہ کو ساتھ ساتھ ہنستے، مسکراتے اور قہقہے لگاتے

ہوئے دیکھ کر حسد ورقابت کی دبی ہوئی چنگاریاں اچانک ہی بھڑک اٹھیں۔

ایک ہوشیار شکاری کی طرح اس نے مغیرہ گل کے قریب آنے کی ایک آخری

کوشش کی۔

بڑی ہی چالاکی کے ساتھ باتوں باتوں میں مغیرہ کے حسن کی تعریف وستائش کی . . .

اسکی خاندانی وجاہت اور دولت وثروت کی شان میں قصیدے پڑھے . . . . . اور

اس کے ساتھ دبے دبے سے طنزیہ لہجے میں ڈھکے چھپے جملے . . . . . جن سے

فواد کی توہین وتضحیک کا پہلو نکلتا تھا ــــ یہ سب دیکھ کر مغیرہ کی پیشانی پر پڑنے والے

بل اور چہرے پر نفرت و حقارت کے واضح تاثرات دیکھکر وہ جل ہی تو گیا۔ جلے کٹے طنزیہ جملے۔۔۔ اور چوٹیں اب اس کا آخری ہتھیار رہ گیا تھا۔!!

فواد نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۔۔ اپنے کانوں سے سنا اور اتنے کلاس فیلوز کے سامنے اپنی ذلت و رسوائی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ سب کے سامنے وہ اعجاز کے ساتھ الجھے۔۔۔۔ بدکلامی یا ہاتھا پائی ہو اور بات بڑھے۔۔۔ مگر اعجاز۔۔۔۔۔ وہ یہی کچھ تو چاہتا تھا۔

فواد سب وار برداشت کرتا رہا۔۔۔ دل پر جبر کر کے۔!!

مغیرہ کی عزت اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ وہ اعجاز جیسے چھچھورے آدمی کے ساتھ الجھ کر دنیا کو تماشا دکھانا اور مغیرہ کے متعلق کوئی سکینڈل برداشت نہ کر سکتا تھا۔۔ یہی وجہ تھی کہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی آج تک ہر جگہ اس نے موقع شناسی اور تدبر کا مظاہرہ کیا تھا مگر اعجاز کے دماغ میں کلبلانے والا کیڑا اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔

وہ موقع کی تلاش میں تھا اور اس نے موقع ڈھونڈ لیا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے جب ایک خوبصورت سا سپاٹ دیکھکر سٹوڈنٹس فوٹو گرافی میں مشغول تھے اور ان سے کافی فاصلے پر پھولوں سے لدے ہوئے ایک تختے کے پاس ایک صدیوں پرانے برگد کے درخت کی گھنی چھاؤں میں کھڑی مغیرہ دریا کی بل کھاتی ہوئی لہروں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے اکیلے پا کر اعجاز موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ جانے کیا سوچ کر اس نے مغیرہ گل کے ساتھ ایک تصویر لینے کی خواہش ظاہر کی۔ کسی فلمی ہیرو کے سے رومینٹک انداز میں۔!!

مغیرہ گل جو اسکی بدتمیزیوں کی وجہ سے پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ضبط نہ کر سکی۔ فواد کیطرح ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیکر بات کو گول کر جانے کی بجائے اس نے اعجاز کو بری طرح جھڑک دیا۔۔۔ بات بڑھ گئی اور اعجاز نے اپنی فطری بیہودگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فواد اور مغیرہ کے خلاف انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کر ڈالے۔!!

مغیرہ پردل خان کے لئے۔۔۔ ایک جنگجو پٹھان قبیلے کے بااثر سردار کی اکلوتی بیٹی کے لئے۔۔۔ اعجاز کا یہ غیر شریفانہ طرزِ عمل بالکل غیر متوقع تھا۔۔۔ وہ اپنی توہین و تذلیل برداشت کرنیکی عادی نہ تھی۔

"تڑاخ" ایک زوردار طمانچہ اعجاز کے منہ پر آن پڑا۔ اعجاز کا چہرہ سرخ ہو گیا اپنی اس ذلت پر۔!!

پیشتر اس کے کہ وہ کوئی اور قدم اٹھاتا فواد مغیرہ کو تلاش کرتا ہوا ادھر آنکلا۔ یہاں منظر ہی نرالا تھا۔

فواد نے دیکھا کہ مارے غیظ و غضب کے وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ شعلۂ جوالا بنی ہوئی تھی۔۔۔ اور اعجاز۔۔۔ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑا وہ بھی تو پھنکار رہا تھا۔!!

فواد کو صورت حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی اور دوسرے لمحے۔۔۔ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ اعجاز کے ساتھ گتھم گتھا ہو چکا تھا۔

شور سن کر ان کے ساتھیوں کی ایک ٹولی بھی ادھر آنکلی اور آتے ہی اقوام متحدہ کا رول سنبھال لیا۔

جتنی دیر میں بیچ بچاؤ کروانے والوں نے ایک کو دوسرے سے علیحدہ کیا۔ فواد

اعجاز کو اچھا خاصا سبق سکھا چکا تھا۔ فواد کے دو تین ہاتھ تو ایسے زبردست پڑے تھے کہ اعجاز کو دن میں تارے نظر آ گئے۔

وہ تو خیر گذری کہ دوسرے لوگ درمیان میں آ گئے ورنہ شائد آج فواد اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دیتا۔

نواں باب

شام گہری ہو چکی تھی جب دس روزہ ٹرپ سے واپس آکر تھکی ہاری مغیرہ گل نے یونیورسٹی گرلز ہوسٹل پہنچ کر اپنے کمرے میں قدم رکھا۔

"تمہارا ٹیلیگرام ۔۔!" رسمی علیک سلیک کے بعد اسکی روم میٹ حسن آرا نے ایک لفافہ اسکی طرف بڑھا دیا۔

"کب آیا تھا ۔؟" دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مغیرہ نے لفافہ اسکے ہاتھ سے لے لیا۔

"آج دوپہر ۔!"

مگر حسن آرا کے جواب سے بے نیاز وہ ٹیلیگرام میں کھو چکی تھی ۔

"فوراً گھر پہنچو ۔!" پر دل خان

باپ کی طرف سے موصول ہونے والے ٹیلیگرام کے اس ایک جملے کے ساتھ ہزار وں اندیشے اور وسوسے اسے گھیر چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے کئی خیال اسکے ذہن میں آئے اور نکل گئے۔

"خدایا خیر ۔! امی خیریت سے ہوں ۔!" اس ماحول میں اپنی ماں سے بڑھ کر اسے کوئی اور چیز محبوب نہ تھی اسلئے قدرتی طور پر اس کا خیال سب سے پہلے ادھر ہی گیا۔

"گھبراؤ نہیں، کوئی ضروری کام بھی تو ہو سکتا ہے۔" حسن آرا نے اسے تسلی دینے کی کوشش

کی۔ وہ ٹیلیگرام پڑھ چکی تھی نا۔

"آخری ٹرین کا وقت بھی جا چکا ہے۔ میں کیا کروں۔؟" مغیرہ بے حد اپ سیٹ نظر آرہی تھی۔

"ہوائی جہاز بھی وہاں نہیں جا سکتا ورنہ تم نائٹ کوچ سے جا سکتی تھیں"

"ہوائی جہاز کہاں، وہاں تو ڈائریکٹ ٹرین بھی نہیں جاتی۔ آخری ریلوے اسٹیشن سے آگے بس، جیپ یا کار پر بھی ایک لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔" مغیرہ نے چند ضروری چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اڑ کر گھر پہنچ جاتی۔

"گھر سے ڈرائیور گاڑی لے کر سٹیشن پر آیا ہوگا۔"

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔؟ تمہیں صبح کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی تم تھکی ہوئی آئی ہو اب آرام کر لو۔"

"لیکن ابھی تو پیکنگ بھی کرنی ہے۔"

"وہ میں تمہارے ساتھ کروا دونگی۔ پہلے تم کھانا کھا لو۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ اگر ڈائیننگ روم میں جانے کا موڈ نہ ہو تو میں یہیں لے آؤں۔؟؟" حسن آرا نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"مجھے بھوک نہیں۔"

مغیرہ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ ذہن میں یکے بعد دیگرے کئی خیال آئے اور نکل گئے۔ الجھا ہوا ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

"یہ لو تھوڑا سا کھا لو۔ میں اپنا اور تمہارا کھانا یہیں لے آئی ہوں۔" مغیرہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا، حسن آرا دونوں کا کھانا میز پر رکھ چکی تھی۔

"حسنہ۔! تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ سچ مجھے ذرا بھی بھوک نہ تھی۔" مغیرہ کی آواز میں احسان مندی کی جھلک تھی۔ اپنی روم میٹ کے خلوص سے متاثر ہو کر اس نے سوچا "کتنی اچھی لڑکی ہے یہ حسن آرا بھی۔! سانولی سی، پیاری سی لڑکی — ! ہمدرد اور مخلص۔!"

"چند نوالے تو لو نا ورنہ بھوک سے رات گذارنی مشکل ہو جائے گی۔ اٹھو۔!"

اور حسن آرا کے اصرار پر مغیرہ کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔ اس کے مجبور کرنے پر بھی کھانا اس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔ بھوک ہی نہ تھی۔!!

باقی رات طرح طرح کے خدشات اور سوچوں نے اسکے ذہن کو مصروف عمل رکھا اور ہزار کوشش کے باوجود وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکی تھی۔

علی الصبح اُٹھ کر اس نے حسن آرا کی مدد سے کچھ ضروری سامان سوٹ کیس میں بند کیا اور باقی اسکے حوالے کر کے یونیورسٹی جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ فواد کو اطلاع دیئے بغیر وہ جا بھی تو نہ سکتی تھی اور یہ اس کے لئے ممکن بھی کب تھا۔؟

اس کے تھوڑی دیر بعد جب فواد نے سٹیشن پر اسے الوداع کہی تو اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کی ہر ہر بات اور ہر ہر انداز سے گھبراہٹ اور بے چینی نمایاں تھی رات بھر کی پریشانی اور بے خوابی کے باعث آنکھیں بھی سوجی سوجی اور سرخ دکھائی دیتی تھیں۔

"مغیرہ۔! میری جان۔! گھبراؤ نہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہی ہو گا۔!" وہ اسے تسلی دینے کی بار بار کوشش کر رہا تھا۔ "چند روز کے بعد تو تم لوٹ آؤ گی۔"

"اوہ . . . فواد۔!" کمزور سی آواز میں وہ جیسے کراہ کر بولی۔ "خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے

میری چھٹی حس کچھ بتا رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔ رات میں نے خواب میں خود کو ایک سرسبز اور بلند پہاڑ کی چوٹی پر سے گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں زخموں سے چور پڑی کراہ رہی ہوں۔ تمہیں پکار رہی ہوں مگر... تم کہیں نظر نہیں آتے۔ اوہ......! میرے اللہ۔! پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ کاش تم میرے ساتھ جا سکتے۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے۔؟ تمہارے گھر والے یہ کیسے برداشت کریں گے۔؟"

"جان! بس دعا کرو کہ وہ دن جلد آئے جب ہمیں یوں چوری چھپے ملاقاتوں کی ضرورت نہ رہے۔ سی۔ ایس۔ پی کرنے کے بعد مجھے کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے تو میں شادی میں تاخیر نہ ہونے دوں گا۔"

گارڈ نے وسل دی۔ گارڈ نے جھنڈی ہلائی اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔

"مغیرہ۔! گھر پہنچتے ہی خط ضرور لکھنا۔ میں انتظار کروں گا۔" وہ ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ "یہ مت بھولنا کہ تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ جو وعدے کیے ہیں انہیں ہر قیمت پر پورا کروں گا۔" گاڑی رفتار پکڑ رہی تھی۔

"اچھا خدا حافظ۔!" فواد نے ہاتھ ہلایا۔ جلدی لوٹ آنا۔"

"خدا حافظ۔!" مغیرہ نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

گاڑی کی رفتار خاصی تیز ہو چکی تھی اور مغیرہ کھڑکی سے باہر سر نکالے پلیٹ فارم پر کھڑے فواد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فواد بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اسے الوداع کہہ رہا تھا اور جب دور سے ہاتھ ہلاتی ہوئی مغیرہ ایک نقطے میں تبدیل ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ جیسے تھکے تھکے قدموں سے لوٹ آیا۔ بجھا بجھا اور.... اداس اداس...!!

" مغیرہ -! میری محبوب -! میرے لئے تو ہی کائنات کی زندگی ہے اور . . . . .
تو ہی اس کا حسن . . . . . !!"
اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا -
آج یونیورسٹی کی زندگی سے بھرپور فضائیں کتنی سونی سونی، اداس اداس اور ویران و بے کیف نظر آ رہی تھیں اسکے بغیر ـــــ اور اس ہنگامہ پرور ماحول میں وہ خود کو کتنا تنہا تنہا اور لٹا لٹا سا محسوس کر رہا تھا - !!
مغیرہ کا وجود اسکی شخصیت کی تکمیل کے لئے کتنا اہم ہے - اسکی ہستی کتنی ادھوری اور بکھری بکھری سی ہے اس کے بغیر - یہ صحیح معنوں میں اسے آج معلوم ہوا تھا - اسوقت، جب وہ اس سے سینکڑوں میل دور جا چکی تھی -
اس روز اس نے صرف ایک ہی پیریڈ اٹینڈ کیا اور گھر چلا گیا - گھر پہنچ کر سارا دن اور ساری رات وہ بستر میں پڑا سوچتا رہا - جانے کیا کیا - !
آج وہ یونیورسٹی آیا تو سہی، لیکچرز بھی اٹینڈ کئے مگر بڑی بے دلی کے ساتھ - یہ غالباً تیسرا پیریڈ تھا - لیکچر جاری تھا مگر . . . وہ کہیں بہت دور پہنچ چکا تھا - کلاس فیلوز اور پروفیسر کی موجودگی سے بے نیاز -! مغیرہ سے باتیں کر رہا تھا - اس سے جلد لوٹ آنے کی التجائیں کر رہا تھا - گرد و پیش سے بے خبر اسکے قرب میں کھویا ہوا تھا - اسکی جھکی جھکی پلکیں سرخ و سفید گالوں پر سایہ کئے ہوئے تھیں اور وہ اسکے قریب کی سیٹ پر بیٹھی نوٹس لے رہی تھی -
" مغیرہ -!" وہ بے ساختہ پکار بیٹھا -
" فواد - ! بیٹا جی -! بہت دور چلے گئے آپ - اب واپس تشریف لے آیئے -!!"

اس کے دائیں ہاتھ بیٹھے حماد کی نظر فواد کی نوٹ بک پر پڑی جہاں پورے کا پورا صفحہ صرف ایک نام "مغیرہ" سے سیاہ ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے بھیا۔ مقام عشق کی اس منزل پر بھی آ پہنچے ہو جہاں عاشق کو ہر شخص کے وجود میں جلوۂ محبوب کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ ابھی تم بیٹھے بیٹھے مغیرہ کو پکار رہے تھے۔ کاپی پر بھی آج مغیرہ کے علاوہ کوئی لفظ لکھا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ آخر بات کیا ہے میرے یار۔ الگتا ہے تم تو گئے کام سے۔!" یہ مظفر تھا۔ بائیں ہاتھ بیٹھا ہوا لڑکا۔!!

"کامریڈ۔! ہوش میں آؤ۔ یہ کلاس روم ہے، نجد کا صحرا نہیں اور تم فواد ہو، قیس عامری نہیں اور زمانہ ہے بیسویں صدی کا۔ کچھ آیا خیال شریف میں۔؟؟؟"

"ویسے فواد اور قیس عامری میں کافی قریبی رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں ہم زلف ہیں شائد۔!" یہ ریحان تھا۔ فواد کے بالکل پیچھے ایک انتہائی شریر، حاضر جواب اور روتوں کو ہنسانے والا طوفان میل قسم کا لڑکا۔ وہ بھی دبی زبان میں ہونے والے ریمارکس سن چکا تھا۔

"ارے نہیں بھئی، تم نے ایک اچھے خاصے معقول قسم کے یونیورسٹی سٹوڈنٹ کو قیس کا ہم زلف بنا کر رکھ دیا ہے۔" مظفر نے سرگوشی کی۔ "ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بات ہے نا میرے خیال میں تو

ع کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی۔"

ریحان اپنی بات پر قائم تھا۔ فواد ہنس پڑا۔ ایک کھسیانی ہنسی۔!

"معلوم ہوتا ہے کہ آج آپ لوگ لیکچر اٹینڈ کرنے کے موڈ میں قطعی نہیں ہیں یا پھر آپ

کی گفتگو کا موضوع ہی اتنا اہم ہے"۔ پروفیسر نے لیکچر دیتے دیتے رک کر انہیں سرزنش کی۔ وہ بڑی دیر سے انہیں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

باقی سٹوڈنٹس بھی مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ چاروں لڑکے محجوب سے ہو گئے تھے فواد نے گھبرا کر نوٹ بک کے اکٹھے کئی صفحے الٹ ڈالے۔ حماد، ریحان اور مظفر بھی سنبھل کر سیدھے ہو بیٹھے۔ سبھی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پین جلدی جلدی نوٹ بک پر چلنے لگے۔ یونہی۔ محض دکھاوے کے طور پر۔ وہ مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پروفیسر کا لیکچر پھر شروع ہوا۔

"دیکھا فیس عامری کے سالے۔! تمہاری وجہ سے ہمیں بھی مفت میں ڈانٹ پڑ گئی۔"

حماد نے کنکھیوں سے فواد کی طرف دیکھ کر دبی آواز میں کہا۔ پروفیسر کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کیا بات ہے۔؟ آپ لوگ کسی بہت ہی اہم مسئلے پر بحث و مباحثے میں مصروف ہیں تو برائے مہربانی دوسروں کو ڈسٹرب نہ کریں۔ کلاس روم سے باہر جا کر اطمینان سے میٹنگ کر لیجئے۔ اُٹھیئے، تشریف لے جائیے۔!" پروفیسر کی پیشانی پر ابھر آنے والی شکنیں اور لہجے کا طنز لڑکوں کے لئے اچھا خاصا ڈوز ثابت ہوا۔

"سوری سر۔!"

" We are extremely sorry —! "

انہوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا اور سنجیدگی سے نوٹس لینے میں مصروف ہو گئے۔

ٹرین میں سارا راستہ وہ کچھ سوچتی رہی۔ گھبرائی گھبرائی، مضطرب اور بے چین سی۔!! جانے کیا کیا خیال ذہن میں آئے اور نکل گئے . . . . اپنی ہم سفر خواتین کے

سوالات کے جوابات بھی اس نے کچھ الٹے پلٹے ہی دیئے تھے۔

"بہت پریشان نظر آتی ہے بیچاری۔!" ایک محترمہ نے اظہار خیال کیا۔

"بیٹی سسرال جا رہی ہو۔؟" ایک ادھیڑ عمر خاتون نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔!" کھردرے لہجے میں مختصر سا جواب ملا۔

"تو کیا میکے۔؟!" مغیرہ کا جواب شاید اسے مطمئن کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔ چہرے پر ناگواری کا تاثر لئے۔ آج وہ اس قسم کے نامعقول سوالات و جوابات کے چکروں میں پڑنے کے موڈ میں بالکل نہ تھی۔

"وہ سٹیشن پر جو چھوڑنے آئے تھے آپ کے شوہر تھے۔؟؟" ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی موٹی بھدی عورت نے اندازہ لگا کر سوال کر ڈالا۔

"وہ نوکری کرتے ہیں یا کوئی کاروبار۔؟" اس کے خیال میں مغیرہ اور فواد کے میاں بیوی ہونے میں تو شک و شبے کی قطعی گنجائش نہ تھی اور اب وہ تفصیلات جاننا چاہتی تھی۔

پریشان حال مغیرہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ان بے تکے سوالات کا کیا جواب دے۔ راہ چلتی یا ہمسفر خواتین کی اس خواہ مخواہ کی بے تکلفی اور کرید نے کی عادت سے اسے ہمیشہ سے چڑ تھی۔ بعض اوقات جب وہ موڈ میں ہوتی تو اس قسم کے الٹے سیدھے سوالات کے ویسے ہی بے تکے اور دلچسپ جواب دے کر سوال کرنے والیوں کی بوکھلاہٹ اور بدحواسی سے جی بھر کر لطف اندوز ہوا کرتی تھی مگر اب۔ ۔ ۔ آج۔!! اور ان کی طرف توجہ دیئے بغیر وہ کھڑکی سے منہ باہر نکالے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھتی رہی۔ اپنی توجہ ہٹانے کی خاطر۔!!

"توبہ توبہ۔ کتنی بد دماغ ہے۔!" موٹی بھدی عورت نے ناک سکوڑ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"دولت اور حسن کا غرور ہوگا۔" دوسری ہمسفر نے آہستہ سے کہا اور نگاہوں ہی نگاہوں میں مغیرہ کے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

مغیرہ کا لباس، اس کا رکھ رکھاؤ اور وضع قطع اس کی امارت اور خوشحالی کا جیتا جاگتا ثبوت تھی نا۔

"بہنا نہیں اللہ میاں دیتا بھی ایسے ہی نک چڑھے لوگوں کو ہے جو اپنی دولت کے نشے میں غریبوں سے بات کرنے کو بھی اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔" ایک اور ہمسفر خاتون نے طبقاتی امتیاز کا سہارا لیکر روایتی انداز میں نکتہ آفرینی کی۔ اسکے زہریلے لہجے میں احساس کمتری بڑا نمایاں تھا۔ بہت سارے کمپلکسز کی شکار کند ذہن عورتوں کی مخصوص ذہنیت سے کام لیتے ہوئے اس نے مغیرہ کی خاموشی سے خود ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس بیگانگی کی وجہ کوئی پریشانی، کوئی الجھن یا کوئی ذاتی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ مغیرہ کے متعلق ان سب کی متفقہ رائے تھی۔

"مغرور"

"متکبر"

"بد دماغ"!

اور نجانے کیا کیا۔

ان سب ریمارکس سے بے نیاز وہ کھوئی ہوئی تھی۔ تصورات و خیالات کی دنیا میں! گردوپیش سے بے نیاز۔

اس کے مصروف ذہن نے شائد ان محترمات کا ایک جملہ بھی پوری توجہ سے نہ سنا تھا۔ اپنے کومینٹس کا کوئی جواب نہ پاکر وہ پھر اپنے آپ میں مگن ہوگئی تھیں۔ انہوں نے مغیرہ کو "ایک سرمایہ دار کی بیٹی کو" قطعی نظر انداز کر دیا تھا۔ شائد انتقام کے طور پر۔۔!!

کتنے ہی سٹیشن آئے اور گذر گئے۔

مسافر اترتے اور چڑھتے رہے!

اور مغیرہ گل کی ہمسفر خواتین جو شائد کہیں بہت دور جا رہی تھیں اپنے ساتھ والی سیٹوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں کو اپنے خاندانی حالات، ساس نندوں، دیوروں، جیٹھوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی داستانیں اور تلخ تجربات کے قصے سناتی رہیں۔

شوہروں کی بے رخی و بے اعتنائی

یا پھر

ان کی بے پناہ چاہت و محبت کے ساتھ ساس نندوں کے حسد اور جلن کے افسانے۔!

تقریباً ہر سٹیشن پر خوانچے والوں کو آوازیں دینے، چاٹ اور پکوڑے خریدنے اور فروٹ کھا کھا کر چھلکے کمپارٹمنٹ میں بکھیرنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

بعض ستم ظریفوں نے پان کھا کر بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیک کی پچکاریاں پھینک پھینک کر کمپارٹمنٹ گندہ کرنے کے علاوہ باقی مسافر عورتوں کے لباس پر بھی گلکاریاں کر ڈالیں۔ ان کی اس حرکت پر بعض نے تو جلی کٹی سنا بھی دیں مگر بعض صرف ناک بھوں چڑھا کر رہ گئیں۔ اور مغیرہ . . . جو سفر میں اکیلے پن اور سیکورٹی کے خیال سے فواد کے کہنے پر پہلی مرتبہ انٹر کلاس میں سفر کر رہی تھی یہ سب کچھ دیکھ کر بہت کچھ

سوچتی رہی۔

اپنے ملک کے غریب اور ناخواندہ عوام میں شائستگی، صفائی اور شہریت کے شعور کا فقدان بڑی شدّت سے محسوس کرتی رہی . . . . اور تب امتحان سے فارغ ہوکر اس نے اپنی تعلیم، سرمائے اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور اپنے علاقے کے عوام سے غربت، جہالت، بیکاری اور دوسری سماجی برائیاں دور کرنے کے لئے ایک سرگرم سوشل ورکر کی حیثیت سے کام کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ اس سلسلے میں فواد کے تعاون سے وہ عوام کی خدمت کے لئے مفید کام انجام دے سکے گی۔ یوں بھی اس کا خیال تھا کہ ملک و قوم کی ترقی کے لئے دولت کو چند ہاتھوں یا چند خاندانوں تک محدود رکھنے کی بجائے ملکی سرمائے کو حرکت میں رہنا چاہیئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ پائینر کا رول وہ خود ادا کرے گی. . . . خواہ اس کے لئے اس کو کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ اپنے باپ کے سرمائے سے اپنے علاقے میں ہسپتال کھولے گی۔ لڑکیوں کے لئے سکول اور تعلیم بالغاں کے مرکز بھی۔!!

دسواں باب

شام کے جھٹپٹے میں ٹرین پہاڑی علاقے کے اس چھوٹے سے سنسان سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ مغیرہ نے باہر جھانکا۔ دور ٹمٹماتے ہوئے بلب کی دھندلی روشنی میں ان کا خاندانی ڈرائیور بوستان بابا ٹرین کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔

"بوستان بابا۔!" وہ ٹرین سے چھلانگ لگا کر اس کی طرف لپکی۔ "گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔؟؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال کر ڈالا۔ دل میں کچھ عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی اور اس کی بیقرار نگاہیں بوستان بابا کے چہرے کی جھریوں میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھیں۔

"سب خیریت ہے بچہ۔!" بوستان خان نے جلدی جلدی ٹرین سے سامان اتارتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کا سفر تو ٹھیک ٹھاک کٹا نا۔؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔؟"

بوستان کے چہرے پر ایک وفادار ملازم کا خلوص اور آواز میں پدرانہ شفقت تھی۔ مغیرہ نے اسکی گود میں پرورش پائی تھی اور بوستان بابا کی نظر میں وہ آج بھی وہی ننھی منی گول مٹول سی گڑیا تھی جو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کی داڑھی کے بالوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اپنی معصوم شوخیوں اور توتلی باتوں سے اس کا دل بہلایا کرتی تھی۔

"بالکل ٹھیک۔ کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" مغیرہ نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے سکون کا ایک لمبا سانس لیا۔

"بی بی گل۔! آپ کوئی گرم کپڑا پہن لیجیے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔" بوستان نے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے مغیرہ کو نصیحت کی۔ "یہ لیجیے شال، میں گھر سے آتے ہوئے لے آیا تھا۔"

"میرے پاس سویٹر موجود ہے۔" مغیرہ نے اٹیچی کیس سے پوری آستین کا سویٹر نکال کر پہن لیا۔

وہ محبوب کے مزاج کی طرح رنگ بدلنے والے ان پہاڑی موسموں سے خوب واقف تھی جبھی تو ہوسٹل سے چلتے وقت موسم گرم ہونے کے باوجود اس نے احتیاط کے طور پر ایک سویٹر ساتھ رکھ لیا تھا۔

"باقی چیزیں تو گھر میں مل ہی جائیں گی۔ بوستان بابا۔! آپ یہ شال اوڑھ لیں۔ ہوا میں خنکی بڑھ رہی ہے۔"

"نہیں بچہ۔! بوستان بابا ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا۔ بظاہر کمزور نظر آنے والے اس جسم میں ابھی کافی جان ہے۔" بوستان نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

آس پاس کے پہاڑوں سے بادل اٹھ اٹھ کر آسمان پر چھا رہے تھے۔ نم آلود ہوائیں بارش کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں اور بوستان بابا ان بادلوں کے برسنے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

بل کھاتی ہوئی پتلی سڑک پر پہاڑوں کی اونچی نیچی ڈھلانوں اور پیچ و خم سے گزرتی ہوئی جیپ گاؤں کی طرف جا رہی تھی اور بوستان بابا جس کا بچپن اور جوانی انہی پر خطر

راہوں پر اپنے سردار پردل خان کی ڈرائیونگ کرتے ہوئے گذری تھی، ان ڈھلانوں اور موڑوں کے ایک ایک اینچ سے واقف تھا۔ ایک مشاق ڈرائیور بڑی ہی احتیاط اور سبک رفتاری کے ساتھ چلتا ہوا اپنے آقا کی بیٹی کو منزل مقصود کی طرف لئے جا رہا تھا۔ ایک مقدس امانت کی طرح۔!!

جیپ عالیشان حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ اس آراستہ پیراستہ قلعہ نما حویلی میں غیر معمولی رونق اور گہما گہمی کا معمہ مغیرہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ بوستان بابا نے بھی راستے میں کوئی بات نہ بتائی تھی۔

"امی۔! امی جان۔!!" گاڑی سے اتر کر وہ بھاگتی ہوئی آگے بڑھی اور برآمدے میں کھڑی ماں سے لپٹ گئی مگر۔ ۔ ۔ آج ۔ ۔ ۔ آج ماں کے انداز میں وہ پہلے کی سی گرمجوشی اور ممتا مفقود تھی۔ لہجہ بھی سرد تھا۔ کچھ روکھا روکھا ۔ ۔ ۔ بجھا بجھا سا۔ ۔ ۔!!

اسی عالم حیرت میں وہ کمرے سے نکلتے ہوئے باپ کو دیکھ کر آگے بڑھی۔

"ابا جان۔! السلام علیکم۔"

باپ نے سلام کا جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور برابر کے کمرے میں چلا گیا۔ کوئی بات کئے بغیر۔!

ہمیشہ کی طرح آج ماں نے پیشانی چومی نہ باپ نے خیر و عافیت اور تعلیمی حالت کے بارے میں کوئی سوال پوچھا۔

اس انوکھے طرزِ عمل اور عجیب و غریب خیر مقدم کو دیکھ کر وہ حیران و ششدر سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی سی۔!! ماں نوکروں کو ہدایات دینے میں مصروف تھی۔ اس کی موجودگی سے لاپرواہ اور بے نیاز۔ وہ مغیرہ کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دے رہی تھی۔

"بی بی گل۔! آپ آگئیں۔؟" اسکی انا بھاگتی ہوئی آئی اور چٹا چٹ مغیرہ کی بلائیں لینے لگی۔ "خدا شادی مبارک کرے۔ سہرے کے پھول کھلیں۔ آج برسوں کی دعاؤں کے بعد میرے پروردگار نے یہ دن دکھایا ہے۔!!"

"شادی۔؟؟؟ کس کی شادی۔؟؟" اس کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔

"آپ کی . . . میری بی بی گل کی۔!" انا نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"مگر . . . مگر کس کے ساتھ . . . .؟" وہ بمشکل بول سکی۔

"اپنے بڑے خان کے بیٹے امیر زادہ خان کے ساتھ۔!"

"امیر زادہ خان . . . .؟؟؟" مغیرہ پر بجلی سی گری۔ چند لمحوں کے لئے تو اس کے ہوش و حواس معطل ہو کر رہ گئے۔ اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے آگے بڑھ کر اس نے ستون کا سہارا لے لیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

"آج سے تیسرے دن برات آئے گی۔" انا اس کی حالت سے بے خبر اپنی ہی رو میں کہے جا رہی تھی۔

"برات۔؟؟ شادی۔؟ امیر زادہ خان کے ساتھ شادی۔؟؟" اس کا ذہن سن سا ہو گیا تھا۔ اور پھر جیسے اسکی ذہنی و جسمانی تمام قوتیں ایک دم سے بیدار ہو گئیں . . . وہ سنبھلی بڑھی . . . اور بھاگتی ہوئی ایک طوفانی جھونکے کی طرح ماں کے کمرے

میں داخل ہوئی۔

"امی۔! امی۔!!" اس نے کمرے کے وسط میں کھڑی ماں کی طرف دیکھا "یہ ہنگامہ کیسا ہے۔؟! میرا امتحان سر پہ ہے اور آپ .... آپ۔"

ماں خاموش تھی۔ اس نے شکایت بھری ایک نگاہ بیٹی پہ ڈالی اور بس .....!!

"امی۔!" ماں کی پراسرار خاموشی سے جھنجھلا کر وہ چیخی۔ "یہ شادی نہیں ہوگی ..... آخر آپ لوگوں کو بیٹھے بٹھائے یہ سوجھی کیا ہے۔؟ میں ابھی شادی وادی نہیں کرواؤں گی۔!" لہجے میں فیصلہ کن سختی تھی۔

"خدا کے لئے آہستہ بولو کہیں تمہارے ابا نہ سن لیں۔ وہ پہلے ہی کھول رہے ہیں۔" ماں نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

"لیکن کیوں .... ؟ میرا جرم۔؟؟؟"

"جرم۔؟ یہ لو۔!" ماں نے آگے بڑھ کر الماری سے ایک لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "اپنے کارنامے دیکھ لو۔" اف کس قدر حقارت اور طنز تھی ماں کے سرد لہجے میں۔ زندگی میں پہلی بار مغیرہ نے ماں کا یہ نیا روپ دیکھا تھا۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھولا اور تصویر حیرت بنی اپنی جگہ پہ کھڑی رہ گئی۔

ٹائپ شدہ گمنام خط کے ساتھ اس کی تصویریں تھیں۔ فواد کے ساتھ کئی پوز۔۔۔ اس کے بے حد قریب۔۔!! اس کے کندھے پر سر رکھے ہوئے۔۔۔ اوہ زرد پڑ گئی۔

لفافہ اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔

اس نے جلدی جلدی خط کی عبارت پر نظریں دوڑائیں۔

خط میں اس کے اور فواد کے تعلقات کو انتہائی گھناؤنے اور شرمناک انداز میں پیش کر کے اس کے والدین کو اس پر کنٹرول کرنے اور ان کو ان کے فرائض کا احساس دلانے کی ایک عیارانہ مگر کامیاب کوشش کی گئی تھی اور آخر میں درج تھا۔

"ایک خیر خواہ"

چند لمحوں کے لئے مغیرہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ شاک اتنا زبردست تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ مفلوج سے ہو کر رہ گئے۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے خط کے الفاظ دھندلے پڑتے گئے اور اس کے پس منظر سے ایک چہرہ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اعجاز کا چہرہ ——!!

ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ——

اور آنکھوں میں انتقام کے شعلے ——!

اور آج . . . آج اس کے پیار کا تاج محل ان شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

"یاد رکھیئے ایک نہ ایک دن آپ پچھتائیں گی ——!" اعجاز کی کرخت آواز اس کے کانوں میں زہر گھول رہی تھی۔ "پیار کا یہ کھیل آپ کو بہت مہنگا پڑے گا ——!" تڑپ کر . . . . اس روز . . . دریا کے کنارے فواد سے مرمت کروا کر اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ بدلہ لئے بغیر نہ رہے گا اور پھر . . . وہ اپنا تڑپ ادھورا چھوڑ کر واپس بھی تو چلا گیا تھا۔

"مغیرہ ——! تم نے ہمارے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ تم نے خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی ہے۔" ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "کس کس طرح میں نے ضد کر کے . . . شوہر کی ناراضگی مول لے کر . . . قبیلے کے بزرگوں سے التجائیں کر کر کے اپنی ذمہ داری پر اعلیٰ تعلیم کے لئے تمہیں یونیورسٹی بھیجا تھا لیکن . . . . آج . . . آج اپنے دودھ کی پاکیزگی

پر میرا مان ٹوٹ چکا ہے۔ میں تمہارے باپ کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتی . . . .
تم نے خاندان کی ناک کٹوا دی۔ مغیرہ۔! تم نے میرے دودھ کی لاج نہیں رکھی . . .
یہ تصویریں اور خط ملنے کے بعد سے اب تک تمہارا باپ کئی بار مجھ پر برس چکا ہے۔!"
مجبور و بے بس ماں کے لہجے میں زخمی ممتا کا درد جھلک رہا تھا۔

"امی۔! یہ سب جھوٹ ہے۔ مجھ پر الزام ہے۔!" مغیرہ کے لہجے میں ایک ایسے ناکردہ گناہ مجرم کی سی عاجزی اور بے بسی تھی جو نامساعد حالات کے بے رحم شکنجے میں کچھ اسطرح گرفتار ہو چکا ہو کہ اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ کچھ نہ بچا ہو۔

"مگر یہ تصویریں۔؟؟؟" ماں پوچھ رہی تھی۔ تحکمانہ اور سخت لہجے میں۔! "یہ سب کیسے ہوا۔؟؟"

"یہ ایک دشمن کی شرارت ہے امی۔۔۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ . . . . آپ کی بیٹی . . . .!!" اور اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

"امی۔! خدا کے لئے کسی طرح یہ شادی رکوا دیجئے۔ مجھے امتحان سے فارغ ہو لینے دیں۔ میرا مستقبل تباہ نہ کریں۔ امی۔!!" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ایک بے بس مشرقی لڑکی کا آخری ہتھیار۔!!

صدیوں پرانے اس ظالم معاشرے کے بے رحم قوانین، ظالمانہ اصول و ضوابط اور رکہنہ رسوم و روایات کو بدل ڈالنا ایک کمزور سی لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔

یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا۔ اس سے قبل بھی کئی من چلے قبیلے کے ان قوانین و ضوابط سے ٹکرانے کی کوشش میں جان کی بازی ہار چکے تھے۔ اس وادیٔ گل کو اپنے جوان اور گرم خون سے لالہ زار بنا کر عشق کے دیوتا کے حضور میں سرخرو ہو چکے تھے۔ بعض کامیاب

بھی ہوئے مگر . . . . . اس کے بدلے میں انہیں اپنے عزیز و اقارب اور جنم بھومی کو خیرباد کہنا پڑا . . . . . ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔!!

"شادی کیسے رک سکتی ہے۔؟" ماں کہہ رہی تھی۔" سب مہمانوں کو مدعو کیا جا چکا ہے۔ تین دن بعد برات آنے والی ہے اور تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

"لیکن ماں . . . .!"

"بس بس۔ اب خاموش ہو جاؤ۔ شادی کے بعد یہ قصے کہانیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے سسرال والوں کو ان باتوں کا پتہ چلے۔ شادی کی تاریخ بھی اتنی جلدی اسلئے رکھی گئی ہے۔ ذرا خود ہی سوچو کہ اگر یہ تصویریں اور خط کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو . . .؟؟"

اور قبیلے میں بدنامی و رسوائی کے ساتھ قتل و خون اور نسل در نسل انتقام کے تصور ہی سے ماں کو ایک جھرجھری سی آگئی۔ وہ اپنی روایات سے واقف تھی نا۔ گولی بندوق کا کھیل یہاں روزمرہ کی بات تھی۔ قبیلے میں ایک سے ایک بڑھ کر ماہر اور جنگجو تھا۔

"لیکن امی . . . . ! میں . . . میں تو فواد کے ساتھ وعدہ کر چکی ہوں۔" دبی زبان اور گھٹے گھٹے لہجے میں وہ کہہ ہی گئی۔

"تو کیا یہ سب . . . یہ سب سچ ہے۔؟" ماں کی آواز ڈوب گئی۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"صرف ایک حد تک . . . . . !" بیٹی کو اعتراف کے بغیر کوئی اور راستہ نظر نہ آیا۔ یوں بھی وہ جھوٹ بولنے کی عادی نہ تھی۔ "امی۔! میں . . . میں فواد کے ساتھ شادی کا وعدہ . . ." وہ رک رک کر بتا رہی تھی۔

"ترطاخ۔!"

زندگی میں پہلی مرتبہ ماں کا ہاتھ بیٹی پر اُٹھ گیا۔ "بے حیا۔ بے غیرت۔! ایسا قدم اُٹھانے سے پہلے تو مر کیوں نہ گئی۔ . . . . کیا میں نے تمہیں اسی دن کے لئے پالا تھا۔؟"

وہ ماں جس نے آج تک اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کو پھولوں کی چھڑی تک نہ چھوائی تھی بیٹی کی اس بیباکی اور دیدہ دلیری پر تلملا اٹھی۔ جانے آج خود بخود ہاتھ کیسے اٹھ گیا تھا قومی غیرت اور خاندانی وقار کا سوال تھا شائد۔! ماں کی پانچوں انگلیوں کا نشان مغیرہ کے سفید سفید اور نرم و نازک گال پر ابھر آیا۔ وہ حیران و ششدر سی آنکھوں میں آنسو بھرے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"ماں۔! تم . . . تم بھی . . . . . ؟؟؟"

خاموش نگاہوں میں ہزاروں گلے، شکوے اور شکائیتیں ایک اجنبی بھی پڑھ سکتا تھا اور . . . . اور پھر وہ تو ماں تھی . . . . . بیٹی کے ایک ایک انداز اور ہر ہر ادا سے واقف۔! اس کے ایک ایک روپ سے آگاہ اور اس کے ہر ہر موڈ سے باخبر۔!!

ماں نے بیٹی کے چہرے پر ثبت اپنی انگلیوں کے نشان کو دیکھا۔ اس کی خاموش اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کے دردناک پیغام کو پڑھا اور بیٹی کے رخسار کا نشان دل کا زخم بن کر ابھرتا ہوا محسوس کیا۔

دل کے خاموش تاروں سے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی ایک آہ نکلی اور ماں نے تڑپ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔

دونوں کی گھٹی گھٹی آہوں نے آنسوؤں کا روپ دھار لیا تھا۔ ماں شفقت بھرا ہاتھ اسکے سر پر پھیر رہی تھی۔ اپنے دوپٹے کے آنچل سے اسکے آنسو پونچھ رہی تھی اور وہ کسی ننھے منے معصوم بچے کی طرح بسک رہی تھی۔ ماں کے سینے پر سر رکھ کر۔۔۔ اسکی

سسکیاں تیز ہوتی چلی جارہی تھیں۔

"مغیرہ۔! پاگل نہ بنو۔۔۔۔!" ماں نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹا کر اس کی پیشانی چومی۔ "بس اب چپ ہوجاؤ بیٹے۔!"

"امی۔۔۔۔! میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔۔۔۔ میں اس پر یہ ظلم نہیں ہونے دونگی۔۔۔۔۔ وہ بہت حساس ہے۔ وہ یہ سب برداشت نہ کر سکے گا۔۔۔۔۔ میں اسکے علاوہ کسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔۔۔۔ میں مرجاؤں گی۔ امی۔! میں خودکشی کرلوں گی۔!"

سسکیاں۔ آنسو اور آہیں۔

"مگر تمہارے ابا۔۔۔۔ یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ تم ان کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو۔" ماں کا مجبور لہجہ اسکی بے بسی کا واضح اعلان تھا۔

"امی۔! خدا کے واسطے یہ شادی روک لیجئے ورنہ۔۔۔۔ میری رگوں میں بھی اسی ضدی باپ کا خون ہے۔ میں ایک غلط انسان سے وابستہ ہوکر ہر روز ایک موت مرنے کی بجائے ایک دفعہ ہی موت کو گلے لگانا قبول کرلوں گی۔ امی۔۔۔۔ امی جان!"

وہ ماں کے سینے میں منہ چھپائے زاروقطار رو رہی تھی۔ ضد کر رہی تھی۔ ماں کے چہرے پر دردو کرب کی لکیریں ابھر آئیں۔ خلا میں گھورتی ہوئی آنکھوں میں غور و فکر کی پرچھائیاں لرزتی جان پڑتی تھیں۔

چند لمحوں بعد اس نے بیٹی کو سہارا دیکر پلنگ پر لٹا دیا اور خود شوہر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ایک عزم اور مضبوط ارادے کے ساتھ۔!!

مغیرہ پلنگ پر الٹی پڑی تکیئے میں منہ چھپائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ چند منٹ اسی عالم

میں گذر گئے۔

"میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ اسکی یہ جرأت کہ ایک مفلس اور قلاش گمنام سے کلرک کے نالائق لڑکے کے لئے میرا برسوں کا انتخاب قبول کرنے سے انکار کر دے۔ میرے خاندان کی بنی بنائی عزت مٹی میں ملا دے۔"

باپ کی گرجدار آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اسکے کانوں میں پڑی۔ وہ دم بخود پلنگ پر پڑی تقدیر کا یہ بے رحم فیصلہ سن رہی تھی۔ اپنے خلاف۔!!

"یہ سب تمہارا قصور ہے۔" وہ دھاڑا۔ "تمہارے لاڈ، پیار اور بے جا حمایت نے اسے اس قدر سرکش اور بیباک بنا دیا ہے کہ آج وہ میرے فیصلوں سے بغاوت پر اتر آئی ہے لیکن کان کھول کر سن لو کہ اب وہ ہرگز یونیورسٹی نہیں جائے گی۔ پروگرام کے مطابق یہ شادی ہو گی۔ اس سے کہہ دو کہ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔!!"

"اگر اس نے سچ مچ خودکشی کرلی تو۔؟؟" ماں کے سہمے ہوئے لہجے میں التجا تھی۔

"مجھے خودکشی کی دھمکی مت دو۔" مغرور و خودپسند جاگیردار ایک زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔ "ایسی گستاخ اور بے حیا لڑکی کو میں خود شوٹ کر دوں گا۔ مجھے اپنے قبیلے کی روایات اور خاندانی عظمت اس کی جان سے زیادہ عزیز ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ۔ . . . .

صرف انہی روایات اور عظمت کو قائم رکھنے کے لئے برسوں پہلے میں نے اپنی محبوب بیوی اور بچی کو قربان کر دیا تھا۔ قبیلے کے بزرگوں کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا اور آج اسے بھی جھکنا ہو گا۔"

پردل خان کی مضبوط اور پاٹ دار آواز میں ایک ایسے ظالم و جابر آمر کا سفاکانہ حکم تھا جو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کو اپنی سب سے بڑی توہین تصور کرتا ہے۔ مغیرہ اس سے زیادہ

نہ سن سکی۔ نیم بیہوشی کی حالت میں گذشتہ رات والا خواب وہ دوبارہ دیکھ رہی تھی۔

گڑھی کی ساری عورتیں اور لڑکیاں حویلی پر منڈلانے والے غم واندوہ کے منحوس سایوں سے بے خبر حویلی کے لمبے چوڑے صحن میں شادی بیاہ کے لوک گیتوں اور علاقائی ناچ میں مگن اپنی خوشیوں اور مسرتوں کا اظہار کر رہی تھیں۔ علاقے کے سب سے بڑے سردار کی اکلوتی بیٹی مغیرہ گل کی شادی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منانے کے لئے تقریبات کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس سارے ڈرامے کے مرکزی کردار کی رائے یا اہمیت کی پرواہ کئے بغیر لوگ اس جشن طرب کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے اپنی بساط کے مطابق کوششوں میں مصروف تھے۔ مگن تھے۔ . . . . رہی مغیرہ تو اس کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت تھی نہ ہوش۔!!

گیارھواں باب

وادیٔ گل کی اس گڑھی سے دور۔ ۔ ۔ ۔ بہت دور شہر میں رات کب کی بھیگ چکی تھی۔ اہل شہر کب کے گہری نیند سو چکے تھے لیکن رات کے اس بیکراں سناٹے میں اس بازار کی چہل پہل اور رونق اپنے شباب پر تھی۔ وہ بازار جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔!!

اس بازار کے ایک کوٹھے پر شہر کی نامور طوائف ستارہ بائی رقص و نغمہ کا بازار بجائے بیٹھی تھی۔ ادائیں بیچ رہی تھی۔ طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کی دھنوں پر تھرک رہی تھی۔ ناچ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ساری کائنات گردش میں تھی۔

بجلی کے بڑے بڑے قمقموں کی چکاچوند کر دینے والی روشنیوں میں اس کا میک اپ زدہ حسن شوخ رنگوں کے چمکتے ہوئے ریشمی لباس میں لپٹا ہوا نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ رقص کا ہر زاویہ۔۔۔ اعضا کی ہر جنبش اور جسم کا ہر خط رہزن تمکین و ہوش تھا۔ دیکھنے والوں پر بجلیاں گرا رہا تھا۔!!

ستارہ بائی کا رقص نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ۔ ۔ اور بجلی کی تیز روشنی میں وہ کسی شعلہ جوالا سے کم نظر نہ آتی تھی۔ ناچ میں اس کی تیزی اور حرارت دیکھ کر تو ایسا جان پڑتا تھا جیسے انگ انگ میں بجلیاں بھر دی گئی ہوں۔۔۔!!

تماشائی جھوم رہے تھے اور ان کے درمیان مغیرہ کا ہونے والا شوہر اور چچازاد بھائی

امیرزادہ خان شراب کے نشے میں دھت ستارہ بائی کی ایک ایک ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کر رہا تھا۔!

"میری جان۔ ۔ ۔ ۔ ایہ لو۔ ۔ ۔ ۔ اور لو۔۔!" نشے کی حالت میں اس نے نوٹوں کی ایک گڈی ستارہ بائی کے قدموں میں پھینک دی۔ "کاغذ کے یہ پرزے تمہارے حسن کی قیمت ۔ ۔ ۔ ؟؟ ارے نہیں۔ ۔ ۔ میری جان۔! یہ روپیہ۔ ۔ ۔ تو ہاتھ کی میل ہے اور۔ ۔ ۔ اور اب۔ ۔ ۔ ۔ تو وہ سونے کی چڑیا بھی ہاتھ آنے والی ہے۔ اس کے ساتھ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ عالیشان حویلی بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنی جاگیر اور۔ ۔ ۔ ۔ اتنا ڈھیر سارا بینک بیلنس بھی۔ ۔ ۔ ۔ بس چند دن کی بات ہے پھر۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ۔ میں وہ سب لاکر۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔!"

شراب کے کئی جام لنڈھانے کے بعد وہ نشے میں بدمست رک رک کر بول رہا تھا۔ ستارہ بائی نے ایک کافرانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک اور جام بھر کر اسے پیش کیا اور امیرزادہ خان اسے آب حیات سمجھ کر ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔ اب اس کا نشہ انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

"جانی۔ ۔ ۔ ۔ ! میں تمہیں اپنے ساتھ۔ ۔ ۔ ۔ اس حویلی میں لے۔ ۔ ۔ ۔ لے جاؤں گا۔ ۔ ۔ تم وہاں رہو گی۔ ۔ ۔ ۔ میرے دل کی رانی۔ ۔ ۔ ۔ بن کر۔ ۔ ۔ ۔ پر میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں وہاں کسی اور گاہک کو نہیں۔ ۔ ۔ ۔ آنے دوں گا۔ ہاں۔ ۔ ۔ ۔ !!"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور ستارہ بائی کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بولا۔

"تم۔ ۔ ۔ تم خوبصورت ہو۔ ۔ ۔ ۔ بوہت ہی خوبصورت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دم

خوبصورت ۔ بالکل شراب . . . کے اس جام کی طرح . . . . تمہیں پتہ ہے نا ۔۔؟؟
میں . . . . میں امیر زادہ خان . . . . تم سے محبت کرتا ہوں . . . . . اتنی . . . . اتنی
. . . . جتنی اس بوتل سے ۔۔!!"

اس نے جام کی بجائے وہسکی کی پوری بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی اور غٹاغٹ ساری کی ساری پی گیا۔ بوتل خالی ہو گئی اور اسکے ساتھ ہی امیر زادہ خان کے حواس بھی مکمل طور پر جواب دے گئے۔

نشے کی ترنگ میں اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور ستارہ بائی کے سامنے لہرا کر بولا۔

"جانتی ہو یہ . . . . یہ کیا ہے . . . ؟ ارے تمہیں کیا پتہ . . . . یہ خط ہے . . . خط . . . ! مغیرہ گل کا . . . . اس سونے کی چڑیا کا . . . . لکھتی ہے . . . . بھائی جان ہا ہاہا بھائی جان . . . . میں نے ہمیشہ آپ کو . . . . ایک بھائی سمجھ کر . . . بہن کی نگاہ . . . سے دیکھا ہے . . . . ہاہا . . . ہا . . . . بہن . . . مغیرہ . . . میری بہن . . . ہونہہ . . . ! شادی سے انکار کر دیجئے . . . ! شادی سے انکار کر دوں . . . . ؟؟ اتنی بڑی حویلی . . . . ساری زمین . . . . اور چچا کا بینک بیلنس چھوڑ دوں . . . . ؟ پر دل خان کا روپیہ . . . اور اتنی بڑی جاگیر چھوڑ دوں . . . ؟؟ نہیں . . . نہیں . . . وہ بے وقوف . . . پاگل لڑکی . . . ہاہا . . . ہا آتے ہی شام کو مجھے خط . . . یہ خط لکھ دیا . . . . میں شہر آنے کے لئے کار . . . میں بیٹھا . . . . وہاں دینے آ گئی . . . خود ہی دینے آ گئی . . . ہا . . ہا . . . ہا ۔ !!" اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش میں ستارہ بائی کے قدموں میں گر کر بے سدھ ہو گیا۔

گڑھی درآدم خان کے حاکم پردل خان کی شاندار حویلی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ علاقائی سازوں کی مسحور کن دھنوں پر مبارکباد کا نغمہ فضا میں جادو بکھیر رہا تھا۔

برات کا انتظار ہو رہا تھا۔

دور . . . وادی میں اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان بہت سی بندوقیں چلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی صدائے بازگشت بھی ۔۔! کہ علاقے کی روایات کے مطابق اظہار مسرت کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔

"بارات آگئی ۔۔!"

"بارات آگئی ۔!"

شور سن کر حاضرین محفل میں ایک ہلچل سی مچی اور لوگ آگے بڑھ کر بارات کا استقبال کرنے کو تیار ہونے لگے۔

فائرنگ کی آواز قریب سے قریب تر آئی چلی گئی۔

مغیرہ کے باپ پردل خان کے ساتھ گڑھی کے سارے معززین نے بارات کا خیر مقدم کیا اور مبارک سلامت کے شور میں علاقے کے رواج کے مطابق دوسری رسومات ادا کی جانے لگیں۔

براتیوں کی چاندماری ابھی تک جاری تھی۔ نشانہ بازی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ وہ دل کھول کر اپنی خوشیوں کا اظہار کر رہے تھے۔ گڑھی کی ساری عورتیں، مرد اور بچے برات کی طرف متوجہ تھے چند سہیلیاں مغیرہ کو بھی مجبور کر رہی تھیں کہ وہ اٹھ کر بارات اور دوسری رسوم کا نظارہ کر لے مگر وہ . . . سہیلیوں کے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور اصرار سے

بے نیاز گم سم سی بیٹھی تھی۔ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی۔ حیران و پریشان سی۔!!
باپ سے گفتگو میں ماں کی ناکامی کے بعد اس نے اپنے باپ کو ایک تفصیلی خط لکھ کر اپنے جذبات و احساسات سے آگاہ کرنے کی ایک اور کوشش کی تھی۔ مگر پیر دل خان کے عزائم ناقابل شکست تھے۔!! اس نے پورا خط پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور ابتدائی چند سطروں سے موضوع کا اندازہ لگاتے ہی اسے آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔!!
آخری ہتھیار کے طور پر اس نے امیر زادہ خان کا سہارا لینا چاہا۔ اسے ایک خط لکھ کر شادی سے باز رہنے کی التجا کی تھی اور اسکے شہر جانے سے قبل موقع پا کر وہ خود یہ خط اس کے ہاتھ میں دے کر آئی تھی۔ مگر...... یہ حربہ بھی کام نہ آسکا۔!!
دو دن میں ہی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور شکل و صورت سے وہ برسوں کی مریض معلوم ہو رہی تھی۔ پیلی پھٹک۔ ہلدی کی طرح زرد۔! کسی پھول کی طرح مرجھائی ہوئی۔!
گذشتہ دو دن سے اس نے کچھ کھایا پیا تھا نہ کسی سے کوئی بات کی تھی۔ ماں اس کے اس رویے سے سہمی سی تھی۔ بیٹی کا یہ طرز عمل دیکھ کر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا.....
مگر جابر اور ضدی شوہر کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہ تھی اور..... وہ کچھ سننے کو تیار بھی کب تھا۔؟
بظاہر اس سارے ہنگامے میں انسانیہ ایک مشفق ماں کے سارے فرائض نبھانے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اندر ہی اندر جیسے کوئی اس کے کلیجے کو مسلے ڈال رہا تھا۔ ایک خاموش آگ تھی جو اسے بھسم کئے دے رہی تھی۔ مارے ڈال رہی تھی۔!!
وہ مصروف عمل تھی..... کسی مسمریزم شدہ وجود کی طرح..... ایک بے جان کٹھ پتلی

کی طرح جو صرف دوسروں کے اشاروں پر ناچنا جانتی ہے۔
تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ کسی نہ کسی کام کے بہانے کمرے میں آتی اور گپ چپ بیٹی پر حسرت بھری نگاہ ڈال کر باہر نکل جاتی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی کا دامن زمانے بھر کی راحتوں سے بھر دیتی۔
"بیٹی کسی طرح مغیرہ کو کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرو۔ اس نے دو دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔"
وہ مغیرہ کی تمام سہیلیوں کو علیحدہ بلا کر ان کی منتیں کر چکی تھی۔ انہیں کھانا اور گرم دودھ کے گلاس بھجوا چکی تھی۔ یہ بھول کر کہ دو دن سے وہ خود بھی بھوکی پیاسی ہی شادی کے دھندوں میں مصروف ہے۔!
اکلوتی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ . . . بھوک پیاس کا احساس تک مٹ چکا تھا۔ . . . مگر مغیرہ، وہ ضدی لڑکی تو کسی منت سماجت یا لعنت ملامت کی پرواہ کئے بغیر بس ایک ہی چپ سادھے بیٹھی تھی۔ کسی بے جان مجسمے کیطرح۔!!
حسینۂ شام دبے پاؤں زمین پر اتر آئی۔
ہر طرف تاریکی پھیلنے لگی اور . . . . .
پھر رات آہستہ آہستہ بھیگنے لگی۔!!
رات کے پچھلے پہر دن بھر شادی کے ہنگامے میں مصروف رہنے والے تھکے ہارے لوگ ذرا سی دیر کے لئے کمر سیدھی کرنے کو لیٹے تو خوشگوار ہوا کے معطر جھونکوں نے تھپک تھپک کر سلا دیا اور یوں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔
مغیرہ نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔

سبھی محو خواب تھے ۔!!

وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے فواد کے نام ایک لمبا چوڑا تفصیلی خط لکھ ڈالا ۔

شادی کی تیاریاں ۔

اپنا انکار ۔

باپ کی ضد ۔

ہنگامہ اور ناکامی ۔!!

آخر میں اپنے خلوص و وفا اور لافانی محبت کا یقین دلانے کے بعد ہمیشہ اسی کی رہنے کا وعدہ ۔۔۔ اور پھر ۔ ۔ ۔ ایک خطرناک عزم ۔! سبھی کچھ لکھ ڈالا تھا ۔ پوچھنے لگی تھی ۔

اس نے خط کو ایک لفافے میں بند کر کے ایڈریس لکھا اور ایک ہمراز سہیلی کو جگا کر وہ لفافہ اس کے حوالے کر دیا ۔ نفس مضمون بتائے بغیر اس نے لڑکی کو تاکید کی کہ ابھی باہر جا کر کسی نہ کسی طریقے سے وہ یہ خط پوسٹ کروا دے ۔

لڑکی چاروں طرف دیکھ کر دبے پاؤں اٹھی اور ایک موٹی سی چادر اوڑھ کر چپکے سے باہر نکل گئی ۔

مغیرہ خاموشی سے اپنے پلنگ پر لیٹ گئی ۔ دل پر سے ایک بھاری بوجھ اتر چکا تھا ۔

کسی حد تک ۔۔۔!!

آج نکاح تھا اس کے بعد رخصتی ۔

سہیلیوں نے اسے بڑے چاؤ سے دلہن بنایا ۔ کپڑے اور زیور پہنایا ۔ بنایا ۔ سجایا ۔ سنورا اور مانگ میں افشاں بھر کر پھولوں سے آراستہ مخملیں دیوان پر بٹھا دیا ۔

شادی بیاہ کے گیت ۔۔۔ دف اور ڈھول کے ساتھ ان گیتوں کے رسیلے بول فضا میں جادو بکھیرنے لگے ۔ گیت جن میں خوشیاں تھیں ۔ مسرتیں تھیں اور . . . . خوش آئند مستقبل کی دعائیں بھی ۔!!

جس کسی نے دلہن کے روپ میں اس ملکۂ کوہسار کو دیکھا ۔ دل بھر کر اس کے حسن کی تعریف کی ۔ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ اس کی قسمت پر رشک کیا ۔ اور بزرگوں نے پھولنے پھلنے کی دعاؤں اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے نصیحتوں سے اپنے فرض کو پورا کرنا مناسب خیال کیا ۔

باہر رسم نکاح شروع ہونے کا غل مچا تو ہجوم مغیرہ کے گرد سے چھٹ کر مختلف گیلریوں برآمدوں اور صحن میں جمع ہو کر رسومات ادا ہوتے ہوئے دیکھنے لگا ۔

مردانے میں جمع ہونے والی بھیڑ سے نکل کر عورتیں اور بچے پھر ایک بار مغیرہ کے گرد جمع ہو گئے تھے ۔

لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتے اور اپنے لئے راستہ بناتے ہوئے نکاح خوان اور گواہ دلہن کی مسند کی طرف بڑھے ۔ وہ گاؤ تکیئے کے سہارے بیہوش پڑی تھی ۔ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ۔

اسے ہوش میں لانے کی تمام کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد چند آدمی ڈاکٹر لانے کے لئے جیپ پر قریبی شہر کی طرف دوڑائے گئے لیکن . . . . ڈاکٹر کے آنے تک تمام کھیل ختم ہو چکا تھا ۔ وہ میٹھی نیند سو چکی تھی ۔ گہری اور ابدی ۔!!

"انا للہ وانا الیہ راجعون ۔" کہہ کر ڈاکٹر نے اپنی بے بسی کا اعلان کر دیا ۔

"ڈاکٹر صاحب ۔! غور سے دیکھیں شاید وہ زندہ ہو ۔" بھیڑ میں سے آواز سن کر ڈاکٹر

نے امیر زادہ خان کی طرف دیکھا" مجھے افسوس ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔
زہر سارے جسم میں سرایت کر چکا ہے"۔

"زہر — ؟"

"زہر — ؟؟؟"
بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔
مگر اس نے زہر لیا کہاں سے — ؟" امیر زادہ خان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔
"کچھ کہا نہیں جا سکتا"
"اوہ ..... ڈاکٹر — ! اس نے ہیرا چاٹ لیا ہے شائد"۔ ایک سہیلی مغیرہ کے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر چلائی۔
سب کی نظریں مغیرہ کے ہاتھ کی طرف اٹھ گئیں جہاں انگوٹھی میں قیمتی پتھر کی جگہ اب ایک خلا باقی رہ گیا تھا۔
موت کی خبر کے ساتھ ہی گھر بھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ مغیرہ کی ماں انسانیہ ..... وہ تو جانے کب کی بیہوش ہو چکی تھی ..... اور باپ — صبر وضبط کا وہ پہاڑ سینے میں کھولتے ہوئے لاوے کو دبائے شادی کے انتظامات کے بعد" اپنی خاندانی عظمت وروایات" کی نعش کی تجہیز وتکفین کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ ہونا پڑا — !!
اپنی وسیع وعریض حویلی کے باغ کا ایک کنج مغیرہ کو بے حد پسند تھا۔ اس جنت نگاہ اور سر سبز وشاداب کنج کے ساتھ ایک خوبصورت جھرنا بھی تھا۔ قدرتی مناظر کے علاوہ بھی مغیرہ نے خوشرنگ وسدا بہار پھول اپنی پسند اور خواہش سے اس جگہ لگوائے تھے اور فراغت کے اکثر لمحات وہ اس خوبصورت کنج میں تنہا بیٹھ کر گزارا کرتی تھی۔

چھٹیوں کے دنوں میں بھی جب گھر آتی تو اسی پرسکون گوشے میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتی تھی۔ امتحان کے دنوں میں سب سے الگ تھلگ ہو کر تیاری کے لئے بھی اس نے باغ کا یہی حصہ منتخب کر رکھا تھا۔ اس دلکش و دلفریب جگہ کا نام "گوشۂ فردوس" بھی اسی کا تجویز کردہ تھا۔ اور باغ کے اس مخصوص حصے کی دیکھ بھال کے لئے مالی کو خصوصی ہدایات بھی وہ اکثر جاری کرتی رہتی تھی۔

اس پرفضا مقام سے اس کی گہری وابستگی دیکھتے ہوئے اسکی انا اور دوسری رشتہ دار خواتین کے مشورے سے اس کی قبر کے لئے بھی باغ کا یہی حصہ منتخب کیا گیا۔

ہوش میں آنے کے بعد مغیرہ کی ماں النسانیہ اپنا دماغی توازن کھو چکی تھی۔ زندگی بھر خاوند کی سرد مہری، بے رحمی و بے اعتنائی کے بعد امیدوں اور آرزوؤں کی واحد مرکز نوجوان اکلوتی بیٹی کی اچانک موت کا صدمہ اسکے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا تھا۔!!

اسی عالم جنون میں وہ کئی بار اپنے داہنے ہاتھ کو زخمی کر چکی تھی۔ . . . . . . وہ ہاتھ جو زندگی میں پہلی اور آخری بار اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی پر اٹھا تھا۔ وہ بیٹی جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب تھی۔ اس کے جگر کا ٹکڑا۔ آنکھوں کا نور اور کلیجے کی ٹھنڈک۔!!

اور یہ ہاتھ . . . یہ ظالم ہاتھ . . . ۔ مغیرہ پر اس وقت اٹھا تھا جب وہ اس دکھ بھری دنیا میں صرف دو تین روز کی مہمان تھی . . . . تھپڑ کھا کر اس کی چھلکتی ہوئی آنکھیں ماں کی طرف اٹھی تھیں . . . . . اوہ کتنے گلے، شکوے اور شکائتیں تھیں اس ایک خاموش نگاہ میں . . . . !!اس کے چہرے پر، نرم و نازک گال پر بھرپور تھپڑ کا نشان کتنا نمایاں نظر آ رہا تھا . . . . آہ . . . . اس کے بعد . . . . . اس کے بعد ۔؟؟ وہ چیخ اٹھی . . . . آنکھیں ابل کر باہر کو نکل آئیں اور . . . . . پھر ایک زبردست

دورہ پڑا۔ اسی عالم وحشت و دیوانگی میں انسانیہ نے اپنے داہنے ہاتھ کو اپنے ہی دانتوں سے چبا ڈالا۔ . . . . پتھروں پر مار مار کر اس کو زخمی کر لیا۔ لہولہان کر لیا۔
سسکتی، بلکتی اور تڑپتی ہوئی ماممتا اس پاگل پن میں بھی خود کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔

بارھواں باب

لٹاپٹا، تباہ حال اور غم واندوہ سے نڈھال فواد مغیرہ کا خط پاکر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جب یہاں پہنچا تو . . . . . کھیل ختم ہو چکا تھا۔ مستقبل کے سہانے سپنوں، امنگوں، آرزوؤں اور ولولوں کا حسین تاج محل مشرقی رسوم و روایات اور سرمایہ داری کی بھٹی سے جنم لینے والے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں آکر بھسم ہو چکا تھا۔ راکھ میں تبدیل ہو گیا تھا۔!!

روایات اور سرمایہ داری کی کالی دیوی اپنی بھینٹ لے چکی تھی۔ مغیرہ گل کی نوخیز جوانی اور ناقابل فراموش حسن و رعنائی کی بھینٹ۔!

فواد کے شباب کی تمام رنگین و دلکش تمناؤں اور جوان خون کے ولولوں کی بھینٹ۔!

النسانیہ . . . ایک دکھی ماں کے ہوش وحواس اور عمر بھر کے سرمائے کی بھینٹ۔!!!

دو چاہنے والوں کا خلوص، محبت اور وفا۔

جوش، ولولے، امنگیں اور آرزوئیں۔

خوبصورت اور خوش آئند مستقبل کے سہانے سپنے اور۔

ماں کا ہر مقدس جذبہ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ راکھ کی ایک ڈھیری میں تبدیل ہو چکا تھا اور اس ڈھیر کے نیچے وہ . . . . . ابدی نیند سو رہی تھی۔ ایسی گہری نیند کہ فواد کی پکار . . . . . آنسو . . . . . آہیں اور گھٹی گھٹی چیخیں غرض کوئی آواز

بھی تو اسے جگانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

مغیرہ کی قبر سے لپٹی۔ قیمتی مگر۔۔۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس، گرد آلود بالوں اور اجڑی اجڑی ویران صورت والی پگلی نے پھٹی پھٹی وحشت زدہ نگاہوں سے فواد کو دیکھا۔ بڑے غور سے۔!۔۔۔۔ پہچاننے کی کوشش میں دیر تک دیکھتی رہی اور ۔۔۔ پھر نڈھال سی ہو کر سر قبر پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ زندگی سے عاجز اور تھکے ہارے زخمی مسافر کی سی بے بسی کے ساتھ۔!

صدمے سے چور چور، روح کے گھاؤ سے نیم جان فواد پگلی انسانیہ کی موجودگی سے بے نیاز لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور مغیرہ کی قبر پر سر رکھ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"مغیرہ۔! میری جان۔۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔۔۔۔؟ اتنی جلد بازی۔۔۔؟ چلی گئیں۔۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔۔۔۔ روٹھ گئیں۔۔۔۔؟؟

اوہ۔۔۔۔ میرا انتظار تو کیا ہوتا۔۔۔۔ میری روح۔۔۔۔! میری زندگی۔۔۔۔! میں تمہارے لئے کیا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ آہ۔۔۔ اف۔۔۔۔! مغیرہ۔۔۔۔ مغیرہ۔۔۔۔!! میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گا۔۔۔؟؟ کیا کروں گا۔۔۔؟ اکیلا۔۔۔ مجھے بتاؤ۔ بتاؤ۔!!"

وہ قبر پر سر ٹپختے ہوئے بچوں کیطرح بلک رہا تھا۔ انتہائی درد و کرب کے عالم میں۔۔۔ سسکیاں۔۔۔۔ آنسو اور آہیں۔!

ادھورے جملے۔

ٹوٹے پھوٹے الفاظ۔ نامکمل ۔ ۔ ۔ ۔ بے ربط اور بعض اوقات سمجھ میں نہ آنیوالے۔!!

وہ چپ ہو گیا۔

روتے روتے نڈھال ہو گیا تھا شائد۔!

دل و دماغ بھی تو مفلوج سے ہو گئے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ پڑا رہا بے حس و حرکت۔!!

اس وادی گل میں گہری شام کو چلنے والی خنک ہواؤں کے خوشگوار سے جھونکوں سے فواد کی آنکھ کھلی۔

"میں کہاں ہوں۔؟؟؟" اس نے دماغ پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر یادداشت بالکل کام نہیں کر رہی تھی۔ اس نے سر قبر کے پتھر پر ٹیک دیا۔ بے بس سا ہو کر۔! بادلوں بھری شام کے ملگجے اندھیرے میں ایک شور سا اس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرایا۔ اس کے بہت قریب۔! کوئی چیخ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے حواس بیدار ہونے لگے۔ اب وہ آواز سن سکتا تھا۔ صاف طور پر۔! آنکھیں کھولکر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ایک جنون و وحشت کے عالم میں وہ پگلی ایک چھ فٹ کے باوقار، وجیہہ اور مضبوط مرد پر چیل کیطرح جھپٹی تھی۔ مرد شائد رات کی آمد اور بارش کے امکان کے پیش نظر اسے اندر لیجانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے نرمی اور پیار سے سمجھا رہا تھا مگر پگلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو کسی صورت قابو میں نہ آ رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا گریبان تار تار کر ڈالا تھا۔ اور اب اسکے ہاتھوں اور کلائیوں کو اپنے دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ اپنے بالوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی شوہر کے مضبوط بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں اس کا منہ نوچ رہی تھی۔

چیخ چلا رہی تھی۔ دہائی مچا رہی تھی۔!

پردل خان بڑی نرمی اور بڑی ہی آہستگی سے اسے کچھ سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ چلا چلا کر ساری دنیا کو سنا رہی تھی۔

"تم ۔۔۔۔ تم ظالم ہو ۔۔۔۔۔ تم میری بیٹی کے قاتل ہو ۔۔۔۔ اسے تم نے قتل کیا ہے ۔۔۔۔۔ تم نے، وحشی ۔۔۔۔۔ درندے ۔۔۔۔۔! تم ایک متکبر اور خود پسند جاگیر دار ہو۔۔ ۔۔۔ تم نے میری خوشیاں لوٹ لیں ۔۔۔۔ میری گود اجاڑ ڈالی ۔۔۔۔ تم ساری عمر مجھ سے دور بھاگتے رہے۔ مجھے جہالت کے طعنے دیتے رہے ۔۔۔۔ پہلے تم نے دوسری شادی رچالی اور ۔۔۔۔ اور اب ۔۔۔۔ اب میری معصوم بیٹی کو مار ڈالا۔۔ ۔۔۔ مجھے برباد کر دیا ۔۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے ۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی ۔۔۔ کبھی نہیں جاؤں گی ۔۔۔ میرے دشمن ہو ۔۔۔ قاتل ہو ۔۔۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی ۔۔۔۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی ۔۔۔۔ نہیں تو تم مجھے بھی مار ڈالو گے ۔۔ ۔۔۔ نہیں ۔۔ نہیں میں تمہیں مار ۔۔۔۔ ڈالوں ۔۔۔ گی ۔۔۔!!"

وہ اس کے سینے پر دو ہتڑیں مار رہی تھی۔ ٹکریں مار رہی تھی اور پھر ۔۔۔ پھر بے بس ہو کر اپنے بال نوچ رہی تھی ۔۔۔ کپڑے پھاڑ رہی تھی اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔

پردل خان کے لباس کا یہ حال تھا کہ قمیص کے چیتھڑے اس کے گلے میں جھول رہے تھے اور جگہ جگہ سے ننگے ہو جانے والے جسم پر انسانیہ کے دانتوں کے نشان تھے جن سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔!

عین عالم شباب میں بیٹی کی اچانک موت۔ بیوی کی وحشت و دیوانگی اور شوہر کے خلاف نفرت و حقارت کا بے پناہ طوفان کسی بھی سخت سے سخت دل انسان کے مضبوط

اعصاب کو کچل ڈالنے اور اسکی ذہنی دنیا تہہ و بالا کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اور وہ۔
وہ تو ایک مرد تھا۔ اپنی جگہ چٹان کی طرح مضبوط مرد۔ جو صرف حکم دینا جانتا تھا۔ زخموں سے چور چور ہو کر بھی مسکرانے کا عادی تھا۔!! قبیلے کا بہادر اور جواں مرد سردار۔!!
کمزور اور بزدل مردوں کی طرح آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لینا اس کے غرور دانا اور مردانگی کی توہین تھی اور اظہار غم اسکی شان مردانگی کے خلاف۔!! لیکن اب ..... اب اس چٹان میں شگاف پڑ چکے تھے۔
مضبوط عمارت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔
اور اس تناور درخت کی جڑیں اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں
کئی دن سے اندر ہی اندر پکنے والا لاوا یوں پھوٹا کہ شدت غم اور ضبط کی بے پناہ کوشش میں پردل خان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔!!
بہترین ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باوجود اس شاندار حویلی سے ایک اور جنازہ نکلا۔ پردل خان کا جنازہ۔!
وہ پردل خان جو قبیلے کا سردار اور ایک بڑا جاگیر دار ہونے کے باوجود مغیرہ کا باپ بھی تھا اور انسانیہ کا شوہر بھی۔!!
ہنستے بستے اور بھرے پرے گھر کی ایسی بربادی پر قبیلے بھر کے لوگوں نے آنسو بہائے۔ اظہار غم کیا اور شکستہ دلوں کے ساتھ اپنے سردار کی نعش کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا۔ اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا۔!!
پردل خان بظاہر ایک سخت گیر اور جابر سردار تھا لیکن اسکے ساتھ ساتھ انتہائی انصاف پسند، با اصول، ارادے کا پکا اور قبیلے کی قدیم روایات کا محافظ اور پاسبان بھی۔!!

کسی کی مجال نہ تھی کہ اسکے سامنے دم مار سکتا۔ اپنی سخت گیری، جاگیردارانہ ذہنیت اور غرور و نخوت کے باوجود وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ گڑھی درآدم خان کے علاوہ آس پاس کے قبائل میں بھی مقبول تھا۔ ان میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس لئے کہ وہ بہترین ایڈمنسٹریٹر اور اعلٰے درجے کا سردار تھا مصائب سے شکست تسلیم کر کے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا اسکی فطرت نہ تھی۔ بہادری، شجاعت، خلوص و شرافت اور وضع داری اسے ورثے میں ملی تھی۔ اپنی اعلٰے تعلیم، بے پناہ ذہانت اور دانشمندی کے باعث وہ انتہائی پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو بھی منٹوں میں حل کر لیا کرتا تھا۔

اس کی ان تھک کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ برسوں سے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہنے والے یہ جنگجو قبائل اب ایک دوسرے کے بہترین دوست اور حلیف بن چکے تھے۔ نسل در نسل انتقام کا جذبہ اب کافی حد تک ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

وہ خود اعلٰے تعلیمیافتہ تھا اور اپنے علاقے میں اس نے بڑی ہی آہستگی اور غیر محسوس طریقے کے ساتھ کچھ جدید رجحانات کو بھی متعارف کرایا تھا۔ اس کی ذاتی کوششوں کی وجہ سے ہی علاقے کے لوگوں میں تعلیم کی اہمیت کا احساس بیدار ہونے لگا تھا۔ خود اسکی اپنی بیٹی عام روایات کے خلاف اعلٰے تعلیم حاصل کر رہی تھی اور گڑھی کے لوگوں کے لئے ایک مثال۔!

یہی وجہ تھی کہ گڑھی درآدم خان کی نئی نسل کے بہت سے بچوں نے قریبی شہروں اور قصبوں کے تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے لئے جانا شروع کر دیا تھا حالانکہ راستہ خاصا مشکل اور دشوار گذار تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر بزرگوں کے مشورے سے گڑھی کے اندر ہی دل خان

کے وقف کردہ ایک قطعۂ زمین پر بچوں کے لئے سکول کی ایک شاندار عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ چھوٹے سے ہسپتال کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا تھا۔ اس ہسپتال کی تعمیر کے تمام اخراجات پردل خان نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔ علاقے کی تعمیر و ترقی کے کئی چھوٹے چھوٹے منصوبے اور اصلاحات اس کے زیر غور تھیں۔ لکیر کے فقیر بزرگوں کی مخالفت سے بچنے اور ان منصوبوں پر عملدرآمد کے لئے وہ آہستہ آہستہ ماحول اور فضا کو سازگار بنانے کا قائل تھا۔ اپنی جاگیر کی آمدنی میں سے ایک معقول رقم ان منصوبوں کی تکمیل کے لئے صرف کرنے کی پلاننگ کر چکا تھا مگر..... مگر حالات کے ظالم تھپیڑوں نے اسے ان منصوبوں پر عمل کرنے کی مہلت کب دی تھی..... ؟؟؟ اپنے تمام ارادوں اور منصوبوں سمیت اب وہ منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا..... اپنی باوقار اور باجبروت شخصیت کی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت ـ!

وہ انسان تھا آخر..... اور اپنے علاقے کے مخصوص طرزِ فکر کے بزرگوں کا جانشین۔!!

پردل خان کے کفن دفن سے فارغ ہو کر قبیلے کے معتبر اور ذمہ دار افراد سر جوڑ کر بیٹھے۔ گڑھی کے نئے حاکم اور قبیلے کے سردار کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔

مصیبت یہ تھی کہ پردل خان کا کوئی بیٹا نہ تھا جو اسکی موت کے بعد اسکی جگہ لے سکتا۔ خاندانی روایات اور قبیلے کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ پردل خان کے گھرانے کا نام بھی زندہ رکھ سکتا۔

کافی غور و فکر اور بحث و مباحثے کے بعد قرعۂ فال پردل خان کے بھتیجے اور مغیرہ گل

کے شوہر امیر زادہ خان کے نام پڑا۔ بزرگوں نے اس فیصلے پر صاد کیا اور ایک عمر رسیدہ بزرگ کے ہاتھوں امیر زادہ خان کی رسم دستار بندی ادا کر دی گئی۔

خلاف توقع اسکے خوابوں کی تعبیر اسے وقت سے بہت پہلے مل گئی اب وہ علاقے کا حاکم تھا۔ علاقے کے سیاہ و سفید اور عوام کی قسمتوں کا بلا شرکت غیرے مالک ۔!!

اسکے دوسرے روز امیر زادہ خان اپنا قدیم گھر چھوڑ کر پردل خان کی عظیم الشان حویلی میں منتقل ہو چکا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کا نقشہ بدل گیا۔ ماحول اور روایات بدل گئیں ۔ یہ عظیم الشان قلعہ نما حویلی نئے سردار کے لئے عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کا مرکز بن گئی۔ اب یہاں ستارہ بائی رہتی تھی ۔ مجرے ہوتے تھے اور امیر زادہ خان کے خوشامدی مصاحبوں کی معیت میں بادۂ گلرنگ کے جام کھنکتے تھے۔

امیر زادہ خان کو ان رنگ رلیوں سے ہی فرصت نہ تھی ۔ . . . جاگیر کے کام اور انتظام کی طرف توجہ کون دیتا۔۔؟ پردل خان کے شروع کردہ منصوبے نامکمل رہ گئے۔ اخراجات بند ہو جانے سے سکول مکمل ہو سکا نہ ہسپتال ۔ ہر کام جہاں تھا وہیں ٹھپ ہو گیا۔ جاگیر میں اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ تھا۔ ہر طرف دھاندلی اور ظلم و جور کا دور دورہ تھا۔ امیر زادہ خان کے کارندے کچھ زیادہ ہی کھل کھیل رہے تھے ۔ جس پر دل چاہا ہاتھ ڈال دیا۔ جس کو جی چاہا پکڑ لیا۔

کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہ تھی اور اس روز تو انتہا ہو گئی جب مغیرہ کی انا کی نوجوان لڑکی پشمینے کو چشمے پر تنہا پانی بھرتے دیکھ کر امیر زادہ خان نے زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنالیا اور کسی کو بتانے کی صورت میں اسکے سارے خاندان کو گولیوں سے اڑا دینے کی دھمکیاں بھی دیں۔

خوف اور شرم کے مارے لڑکی زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکی۔ لیکن چند ماہ بعد جب اس پاپ کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ . . . پرانی ملازماؤں میں چہ مگوئیاں اور معنی خیز اشارے شروع ہو گئے تو لڑکی نے مارے شرم و غیرت کے جھیل میں کود کر خودکشی کر لی۔

انا اور دوسری ملازماؤں کو سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی زبان کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس حادثے کے بعد انا تو ایسی چارپائی پر پڑی کہ پھر اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

سردار امیر زادہ خان کے حد سے بڑھتے ہوئے ظلم و تشدد اور دھاندلیوں کو دیکھ کر علاقے کے عوام میں اضطراب پھیل رہا تھا۔ بعض نے دبی زبان سے نکتہ چینی کرتے ہوئے قبیلے کے ذمہ دار بزرگوں سے شکایت بھی کی مگر جانے کس مصلحت کے تحت وہ بھی خاموش رہے اور بعض اسے جوان خون کا لاابالی پن تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کا فقدان سمجھ کر خاموش ہو گئے۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی سنبھل جائے گا۔ ہم اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔"

ان کا یہ جواب شکایت کرنے والوں کو مطمئن نہ کر سکا مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔؟؟ ایک طرف دولت کا نشہ تھا۔ اتنی لمبی چوڑی جائداد کا مان اور کرائے کے سپاہیوں

کی طاقت پر گھمنڈ اور غرور ـــــ اور دوسری طرف وسائل سے محروم دو وقت کی روٹی کی جدوجہد میں مصروف چند جذباتی نوجوان ـــــ! مقابلے کا تصوّر بھی محال تھا۔!!

تیرھواں باب

مغیرہ کی اچانک موت کے روح فرسا حادثے نے فواد کی ذہنی و روحانی دنیا تہہ و بالا کر ڈالی تھی۔

ہوش و حواس اور سوچنے سمجھنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا۔

جذبات و احساسات کی رنگین و دلکش دنیا اجاڑ ڈالی تھی۔ تباہ کر ڈالی تھی۔

تصورات و تخیلات کی دنیا پر کچھ ایسی بجلی گری تھی کہ خرمن ہستی کا ہر شگفتہ پھول جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

گلشن حیات پر خزاں کچھ اس انداز سے آئی تھی کہ بہاریں جیسے ہمیشہ کے لئے ادھر کا راستہ بھول گئیں۔ امید کی کوئی بھولی بھٹکی کرن بھی کہیں دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔!!

کئی ماہ تک وہ بستر علالت پر پڑا رہا۔

اکیلا، اکیلا ــــ اداس ــــ پریشان اور ــ کھویا کھویا سا ــ!!

ایک عالم دیوانگی میں گھنٹوں مغیرہ سے باتیں کئے جاتا۔

گلے، شکوے اور شکائتیں۔

ہجر و فراق کے لمحات کا درد و کرب۔

اپنی مجبوری و بے بسی کی داستان یا پھر . . . مغیرہ گل کی رفاقت میں گذرے ہوئے حسین و دلکش لمحات کے سحر میں کھو کر گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا۔ ماضی کے حسین

تصور میں گم ہو جانا۔
پیار کے سرمدی نغمے۔
مغیرہ کی ساحرانہ مسکراہٹ
دل میں اتر جانے والا انداز گفتگو۔
روٹھنا — منانا
شخصیت کا جادو ..... اور
شوخ و شنگ محبوبانہ ادائیں —!!

ایک ایک چیز، ایک ایک بات اسے یاد آتی۔ گھنٹوں تڑپاتی۔ پہروں بے چین و بیقرار رکھتی اور فواد گھٹی گھٹی چیخوں کو حلق میں دبانے کی کوشش میں تکیے میں منہ چھپا لیتا۔

پرسکون نیند کے لئے خواب آور گولیاں اس کا سب سے بڑا سہارا تھیں۔ وہ ہمیشہ کا جذباتی اور حساس تھا۔ خود پر قابو پانے اور نارمل حالت میں آنے میں اسے کئی ماہ لگ گئے۔

یونیورسٹی جانا شروع کیا تو وہاں کی ہر ہر چیز کے ساتھ مغیرہ گل کی یادیں لپٹی ہوئی نظر آئیں
کلاس روم میں اس کی سیٹ۔
یونیورسٹی لان میں اس کی مخصوص جگہ۔
لائبریری۔
کیفے ٹیریا۔
وہ ہر جگہ موجود ملتی۔

ہنستی مسکراتی اور قہقہے لگاتی ہوئی ۔ !!

لائبریری میں اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھی وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ مطالعے اور نوٹس بنانے میں جذب دکھائی دیتی ۔

ہال میں ٹیبل ٹینس یا کوئی اور ان ڈور گیم کھیلتی ہوئی ملتی ۔

گراؤنڈ میں بیڈمنٹن کے خوبصورت کرٹے لگاتی ہوئی دکھائی پڑتی ۔

کلاس میں کسی بھی اہم موضوع پر بحث کے دوران پروفیسرز اور لیکچررز اس ذہین طالبہ کی کمی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتے اور فواد ..... وہ تو ہر لمحہ، ہر پل اور ہر گھڑی اسے اپنے ساتھ ساتھ محسوس کرتا ۔ وہ اس کی رگ رگ اور خون کے ایک ایک قطرے میں سما چکی تھی ۔

وہ جاگتے میں خواب دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا ۔

سہانے اور میٹھے خواب ـــــ !! جو شکستہ دل کو فریب دینے کا بہانہ بن گئے تھے ۔

کہ ڈوبتا آدمی تنکوں کے سہارے تلاش کرتا ہے ۔ !

دن گذرتے گئے ـــ

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے ـــ !!

قانون فطرت کے مطابق وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ فواد کے زخم مندمل ہو رہے تھے ۔ معاشی بدحالی اور گھریلو ذمہ داریوں کے شدید احساس کے ساتھ دوستوں اور عزیزوں کے خلوص و ہمدردی اور دلجوئی کی بدولت اب آہستہ آہستہ وہ اپنی دنیا میں واپس آرہا تھا ۔ ایک حقیقت پسند انسان کی طرح ۔ !

وہ کسی سرمایہ دار یا جاگیردار کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا نہیں، ایک مفلس کے گھر کا چراغ

تھا۔ ایک غریب کلرک کا بیٹا۔ دس گیارہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑا۔ ذمہ دار اور فرض شناس بیٹا۔!!

باپ منتظر تھا کہ کب اس کا جوان بیٹا پڑھ لکھ کر باپ کا بازو بنے۔ اس کا بوجھ بٹائے۔ ماں گن گن کر دن کاٹ رہی تھی اور صبح و شام دعاؤں میں مصروف، کہ شوہر کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب آرہے تھے۔ میاں کی ریٹائرمنٹ سے قبل بیٹے کی کامیابی اور اچھی ملازمت کے لئے سجدے کرتے کرتے اسکی پیشانی پر محراب پڑ گیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی اور بیقراری کے ساتھ اس دن کی منتظر تھی جب اس کا ہونہار اور لائق بیٹا تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں سنبھالے گا اور جوان بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے ایک بھائی ہی نہیں بلکہ باپ کے فرائض بھی انجام دے گا کہ اقتصادی طور پر بدحال اس مشرقی سوسائٹی کی ریت یہی تھی۔

مغیرہ کی موت کے بعد فواد کی وحشت و دیوانگی دیکھ کر باپ اپنی جگہ حیران تھا۔ اسے اپنے خواب پریشان ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

ماں کا دل الگ ڈوب رہا تھا اور ننھے بھائی بہن "بھائی جان" کی صحت یابی کی دعائیں کرتے نہ تھکتے تھے۔

فواد کو دن رات نصیحتیں کرنے کے ساتھ ساتھ سارے گھر کے افراد اسکی تسلی، تشفی اور دلجوئی میں لگے رہتے۔ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور... مغیرہ کے متعلق سوچنے کے لئے اسے پل بھر کو بھی تنہا نہ چھوڑتے تھے۔

فواد گھر کے حالات سے بے خبر تو نہ تھا۔ وہ ماں باپ کی مجبوریوں سے بھی آگاہ تھا اور اپنے فرائض سے باخبر۔!!

اور تب ..... غمِ جاناں میں غرق ہو کر دنیاوی فرائض کو نظر انداز کرنے کی بجائے اس نے غمِ دوراں کو اپنا لیا۔ گلے سے لگا لیا۔ دل کے زخموں کو چھپا کر۔!!
سالانہ امتحان کے دن قریب آ رہے تھے فواد نے خود کو سنبھالا اور کتابوں کی دنیا میں گم ہو گیا۔ اپنے لئے جینے کی ہر امنگ ختم اور جوانی کا ہر ولولہ سرد پڑ چکا تھا مگر ..... وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ دوسروں کے لئے۔ ایک کامیاب و کامران شخص کی حیثیت سے۔!!
اپنے بوڑھے والدین کی خاطر۔
ان کے بڑھاپے کا سہارا بن کر۔
چھوٹے بھائی بہنوں کے لئے۔
ان کا مستقبل سنوارنے اور انہیں زمانے کی بے رحم ٹھوکروں سے بچانے کے لئے۔
جوان بہنوں کی مانگ میں سیندور بھرنے کے لئے۔
ان کے ہاتھوں میں مہندی رچانے اور انہیں سہاگ کے جوڑے پہنانے کی خاطر وہ دن رات محنت کر رہا تھا۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین اس نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ وہ جی رہا تھا۔ ایک کامیاب شخص کی حیثیت سے جینے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ محض دوسروں کی جھولیاں خوشیوں سے بھرنے کے لئے۔! وہ سمجھتا تھا کہ اسکی زندگی امانت ہے۔ والدین کی، بھائی بہنوں کی۔!!
آخر ضعیف اور دکھی والدین کی دعائیں رنگ لائیں۔ فواد کی شبانہ روز کی محنت کا ثمر اسے یوں ملا کہ اس نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ گولڈ میڈل حاصل کیا اور پھر سکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔ وطن سے ہزاروں میل دور۔ سات سمندر پار۔!!

چودھواں باب

حویلی پر ستارہ بائی کا راج تھا۔۔۔۔ وہ نہ صرف امیرزادہ خان کے دل پر حکومت کرتی تھی بلکہ جاگیر کے تمام انتظامات بھی اسکے ہاتھ میں تھے۔۔۔۔ لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ عروج پر تھا کہ ستارہ بائی کم سے کم وقت میں امیرزادہ کی تمام زمین، جائیداد اور روپے پیسے پر مکمل قبضہ کر لینا چاہتی تھی۔

جدی پشتی طوائف تھی نا آخر۔۔۔ اور پھر ان من چلے جاگیرداروں کا کیا اعتبار۔۔۔ کون جانے ان کے ہرجائی دل کو کب کوئی اور بھا جائے۔۔۔۔ بازار میں نئے اور تازہ مال کی کمی تو نہ تھی۔۔۔۔؟ پھر انتظار کس بات کا۔۔۔؟ وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔۔۔۔؟؟؟

حویلی میں آئے دن ناچ رنگ اور شراب و کباب کی محفلیں گرم ہوتیں اور ستارہ بائی انکی روح رواں بن کر ساقی اور رقاصہ دونوں کے فرائض انجام دیتی۔

گھنگھروؤں کی چھن۔۔۔ چھنا۔۔ چھن۔۔۔ طبلوں کی تھاپ۔۔۔۔ سازوں کی موسیقی اور۔۔۔۔ آہ۔۔۔ واہ کے نعروں کے درمیان جام پر جام لنڈھائے جاتے۔۔۔ روپوں کی بارش ہوتی اور ستارہ بائی کی کافرانہ اداؤں کے گھائل ایک عالم بدمستی و مدہوشی میں گناہ و ثواب کے فلسفے سے بے نیاز ہو کر دل کھول کر رنگ رلیاں مناتے۔

گردوپیش سے بے پروا۔
دنیا و مافیہا سے بے خبر۔
وہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔!!

ستارہ بائی اگرچہ اپنے لاتعداد چاہنے والوں کو اس بازار میں چھوڑ کر اس دور افتادہ علاقے میں مقیم تھی مگر . . . . ماں سے ملنے کے بہانے کبھی کبھار شہر جانے اور ان لوگوں سے رابطہ قائم رکھنے کا سلسلہ جاری تھا۔

ستارہ بائی کی ماں جو بیٹی کے حسن و جمال . . . . جوان و دلکش جسم اور رسیلی آواز کے جادو کی بدولت ہر رات ہزاروں روپے کمانے . . . . . شہر کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی تجوریاں خالی کروانے اور ان سے بیش قیمت تحائف بٹورنے کی عادی تھی، اس صورتحال سے کچھ مطمئن نظر نہ آتی تھی کہ گاہک . . . .
"اچھا مال نہ پاکر آہستہ آہستہ ادھر کا راستہ بھولتے جا رہے تھے۔ اگرچہ گاہکوں کی آمدورفت باقاعدہ رکھنے کے لئے اسکے پاس کچھ اور "مال" بھی موجود تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ ستارہ بائی کے جانے کے بعد اس کا کاروبار کافی حد تک ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔

ایک بوڑھی نائکہ کے لئے یہ صورتحال بے حد تشویشناک تھی اور وہ اس کوشش میں تھی کہ سردار امیر زادہ خان پر اچھی طرح ہاتھ صاف کرنے کے بعد ستارہ بائی جلدی سے واپس آکر اس بالاخانے کی لٹی ہوئی رونق کو بحال کر دے۔

امیر زادہ خان ایک جنگجو قبیلے کا اکھڑ جوان تھا اور ستارہ بائی کی ملکیت کا بلا شرکت غیرے متمنی۔ اس کے تیور عام گاہکوں سے مختلف تھے۔ اور ستارہ بائی کی ماں ان تیوروں سے کسی قدر خائف بھی نظر آتی تھی۔

وہ بیٹی کو امیر زادہ خان کی دولت پر اچھی طرح ہاتھ صاف کرنے کے نت نئے گر سکھانے کے ساتھ ساتھ پرانے آشناؤں کو بھی ہاتھ میں رکھنے کی ہدایات دیتی رہتی تھی ..... کہ یہ گھاگ نائکہ اپنے زمانۂ شباب میں بڑے بڑے راجاؤں اور نوابوں کو تباہ و برباد کر کے ان سے اپنے حقے کی چلمیں بھروا چکی تھی۔ جوتے پالش کروا چکی تھی۔ اور اب .... اب ستارہ بائی کے جوان ہوتے ہی وہ سنہری زمانہ پھر لوٹ آیا تھا۔

اداؤں کی اس سوداگر نے ستارہ بائی کو کچھ اس طرح ٹرینڈ کیا تھا کہ وہ چاروں طرف سے روپے پیسے سکوں کی جھنکار سن رہی تھی۔ روپے میں کھیل رہی تھی..... اور ہیرے جواہرات کی چکا چوند سے اسکی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں مگر.... اب.....؟؟

وہ کسی قدر پریشان تھی..... !ستارہ بائی امیر زادہ خان کی حویلی میں جا کر اپنے ساتھ اس کے مستقبل سے بھی لاپروا ہوتی جا رہی تھی..... کم از کم اس کا یہی خیال تھا۔

اور پھر... اسی بوکھلاہٹ میں وہ ایک دن بالکل اچانک اس حویلی میں پہنچ گئی۔ ایک دلال قسم کا لمبا چوڑا آدمی بھی اسکے ساتھ تھا۔

"بیٹی۔! تم طوائف ہو۔ خاندانی طوائف۔!" تنہائی ملتے ہی اس نے بڑے فخریہ لہجے میں ستارہ بائی کو سمجھانے کی کوشش کی "سنو۔! طوائف کا کام سنجیدگی سے دل لگا کر گھر بسانا اور بچے پیدا کرنا نہیں بلکہ ان جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور تاجروں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا ہے۔ اپنی ساحرانہ اداؤں، عشووں اور غمزوں سے لبھا کر ان کی تجوریوں سے آخری کوڑی تک نکلوا کر انہیں بے نیازی سے ٹھوکر مار دینی چاہیئے کہ طوائف کی فطرت اور اسکے حالات کا تقاضا یہی ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔؟؟"

وہ بیٹی کو نصیحت کررہی تھی۔ ۔ ۔ ، اور بیٹی، وہ خود کیا کم تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ماں کی تجاویز پر عمل پیرا تھی۔ بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ۔!!

وہ امیرزادہ خان کو انگلیوں پر نچا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ بلا سوچے سمجھے اسکے اشاروں پر رقص کر رہا تھا۔ کسی بے جان کٹھ پتلی کیطرح۔ ۔ ۔ جس کی ڈور ستارہ بائی کے ہاتھ میں تھی۔!!

امیرزادہ خان۔ ۔ ۔ ۔ علاقے کا سب سے بڑا سردار۔ ۔ ۔ تند خو۔ ۔ ۔ ۔ ظالم و جابر اور۔ ۔ ۔ سرکش و بیباک۔!!

وہ ایک ایسا منہ زور گھوڑا تھا جس کو لگام دینے کا فن صرف ستارہ بائی جانتی تھی۔ وہ اسکی کمزوریوں سے واقف تھی اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ڈھنگ بھی اسے خوب آتا تھا۔ ناز و انداز دکھا کر۔ اپنے حسن و رعنائی کے بل بوتے پر۔ اپنی سریلی آواز کا جادو جگا کر۔ رقص و نغمہ کی مدہوش کن ادائیں دکھا کر وہ اسے مکمل طور پر اپنے جال میں پھانس چکی تھی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔

امیرزادہ خان شادی کے لئے پیہم اصرار کر رہا تھا۔ مصلحتاً ستارہ بائی اسکے ساتھ یہ بندھن باندھنے پر بھی تیار ہو چکی تھی کہ اسکی ساری جائیداد اور بڑے شہر میں رکھے ہوئے بینک بیلنس پر قبضہ کرنے کا یہی ایک بظاہر معقول راستہ اسے نظر آتا تھا۔

امیرزادہ خان منتظر تھا۔ بیقرار تھا اس لمحے کی آرزو میں جب ستارہ بائی کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے گا اور وہ اسکی منکوحہ بیوی کی حیثیت سے اس حویلی کی مالکہ بنے گی اور تب۔ ۔ ۔ ستارہ بائی کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا خدشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن سے نکل جائے گا۔

ستارہ بائی کے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر تھی کہ حویلی کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سجنے لگی۔

نئے قالین۔

جھاڑ فانوس۔

مخملیں پردے۔

اور نیا فرنیچر۔!! سبھی کچھ آگیا۔

حویلی کے درودیوار، کمرے اور محرابیں، سبھی کو آراستہ کیا گیا۔ ستارہ بائی کے ذوق کیمطابق۔!! نئے رنگ وروغن ہوئے۔ باغ کی صفائی اور جھاڑ جھنکاڑ کی کٹائی کر کے پھولوں کی کیاریاں اور تختے نئے سرے سے ترتیب دیئے گئے۔ سب چیزوں کی آرائش و زیبائش کے بعد ستارہ بائی اور امیر زادہ خان کی شادی کا جشن بڑی دھوم دھام سے شروع ہوگیا۔

اوباش اور عجیب وغریب قسم کے مہمانوں کی آمدورفت۔

شادی کی تقریبات۔

چہل پہل۔ رونق اور ہنگامہ۔!!

جشن اتنا زبردست تھا کہ موازنہ کرنے والوں کے نزدیک مغیرہ اور امیر زادہ خان کی شادی کے جشن اور رونق کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ آج سے پہلے علاقے کی کسی بھی شادی میں ایسی شان وشوکت اور دھوم دھام دیکھنے میں نہیں آئی۔ ستارہ بائی اور امیر زادہ خان کی شادی کی شاندار تقریب کے سامنے علاقے میں منعقد ہونے والی ہر تقریب کا رنگ پھیکا پڑگیا تھا۔

جشن مسرت عروج پر تھا۔ . . . ناچ گانا . . . شراب وکباب اور ہلڑ بازی۔!!

اور . . . انسانیہ، پردل خان کی بیوی . . . . . . اس جاگیر اور حویلی کی اصلی مالکہ . . .
پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس . . . . جھاڑیوں جیسے الجھے الجھے خشک بال اور چہرے
پر خستہ حالی و درماندگی کی انتہا لئے کسی بے چین و بے قرار روح کی طرح ادھر ادھر
بھٹک رہی تھی۔
کھوئی کھوئی۔ الجھی الجھی سی۔
کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی حیران اور پریشان سی۔!!
گھر کی صفائی اور آراستگی کے وقت دوسرے کوڑے کباڑ کے ساتھ مغیرہ اور اسکی
ماں کا سامان بھی اٹھا کر حویلی کے ایک کونے میں ملازموں کی ایک کوٹھڑی میں پھینک
دیا گیا تھا اور ساتھ ہی انسانیہ کو بھی۔ رہائشی کمروں سے دور، اسے الگ تھلگ نوکروں
کے ساتھ اسی کوٹھڑی میں پناہ ملی تھی۔ کہ ستارہ بائی اور امیر زادہ خان ایک پاگل بڑھیا
کو اپنے عیش و آرام میں مزید خلل ڈالنے کی اجازت نہ دے سکتے تھے۔
شادی کے ہنگامے اور شان و شوکت کے اس عظیم مظاہرے نے اسکی وحشت،
دیوانگی اور جنونی کیفیت میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا تھا۔
مہمانوں کی آمد و رفت، چہل پہل اور جشن طرب کی رونقیں دیکھ کر اسکی آنکھوں کے سامنے
ایک اور شادی کا ہنگامہ خیز منظر مجسم ہو کر رہ گیا تھا۔ ذہن کے پردے پر تمام واقعات
کسی فلم کیطرح لہراتے ہوئے تیزی سے گذر رہے تھے۔
اب سے کچھ عرصہ پہلے بھی یہ حویلی دلہن کی طرح سجی تھی۔
مہمان آئے تھے۔ بالکل اسیطرح۔
پردل خان ان کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ انتظامات میں مصروف تھا۔ تلواروں کا بھی رقص

اور مبارکباد کا ہی نغمہ فضا میں جادو بکھیر رہا تھا۔ یہی رونق اور چہل پہل تھی۔
امیر زادہ خان۔۔۔۔ اس شادی میں بھی دولہا بنا تھا اور۔۔۔۔ اور مغیرہ گل دلہن۔۔
۔۔۔!! اس کے بعد۔۔۔۔! اس کے بعد۔۔۔۔؟؟؟ زہر۔۔۔۔ لاش۔۔۔۔
مغیرہ گل کی۔۔۔۔ پیردل خان۔۔۔۔ کی۔۔۔۔!!
وحشت و دیوانگی کا ایک زبردست دورہ پڑا اور رانسانیہ نے اپنے کپڑے تار تار کر دیئے۔
سر میں خاک ڈال لی۔۔۔۔ سر دیواروں سے ٹکراتی پھری اور اسکی دلدوز چیخوں سے سننے
والوں کے دل دہل دہل گئے۔ دیواروں کے ساتھ ٹکریں مارنے کی وجہ سے سر سے
خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی۔
مہمانوں میں سے کسی نے اٹھا کر کسی بیکار اور فالتو چیز کی طرح اسے کسی کونے کھدرے
میں پڑی ہوئی ایک ننگی چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ خاموش لیٹی ہوئی چھت کو گھورے جا رہی
تھی۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ درندگی تھی اور ایک خوفناک سی چمک بھی۔!!
شادی کی تقریب انجام پائی۔
کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر مہمانوں کو اپنے خوشامدی مصاحبوں کے سپرد کر کے
امیر زادہ خان نے حجلۂ عروسی کا رخ کیا نورات گہری ہو چکی تھی۔ چاند نکل آیا تھا اور
کئی دن کے تھکے ہارے ملازمین سونے کے لئے اپنی اپنی کوٹھڑیوں کا رخ کر
رہے تھے۔
حجلۂ عروسی کے طور پر امیر زادہ خان نے مغیرہ کا کمرہ منتخب کر کے اسے ستارہ بائی
کی خواہش کے مطابق آراستہ کیا تھا۔ فرش پر نئے اور خوبصورت ایرانی قالین،
بہترین فرنیچر اور کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری مخملیں پردے لٹکائے گئے تھے۔

پھولوں کی سیج سجائی گئی تھی اور سارا کمرہ مدہوش کن خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔
امیرزادہ خان بلا کا شراب نوش تھا۔ پیتا اور بے تحاشا پیتا۔!! آج بھی مہمانوں سے فراغت پاکر اس نے اکٹھے کئی جام چڑھا لئے تھے۔ ستارہ بائی کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اسکی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے اور نشے کی انتہا کے باعث آواز بھی کانپتی ہوئی اور غیر متوازن تھی۔
ستارہ بائی کے لئے یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ وہ امیرزادہ خان کے اس روپ کی عادی ہو چکی تھی اور ایسی حالت میں اسے ہینڈل کرنے کے ڈھنگ سے واقف۔!!
ستارہ بائی نے لڑکھڑاتے ہوئے سردار کے ہاتھ سے بوتل لیکر پاس ہی پڑی ہوئی میز پر رکھی اور اسے سہارا دیکر پھولوں کی سیج تک لے گئی اور ..... اور پھر وہ ایک دوسرے میں جذب ہو گئے۔
رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔
کائنات سو رہی تھی ۔ گہری نیند میں مدہوش۔ !
ہر طرف خاموشی طاری تھی اور . . . . چاند ڈوب چکا تھا۔!!
"آگ ۔! آگ ۔!"
"بچاؤ۔ بچاؤ ۔!"
رات کی مہیب تاریکی اور سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک نسوانی اور دوسری مردانہ چیخ سنائی دی۔
"آگ ۔ آگ ۔"
"بھاگو۔! دوڑو۔"
چیخ و پکار اور شور و غل کے درمیان ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

امیرزادہ خان اور ستارہ بائی نے دیکھا کہ ان کا تمام کمرہ دھوئیں سے بھر چکا تھا۔ وہ بدحواس ہو کر دروازے کی طرف لپکے مگر . . . . . دروازہ باہر سے بند تھا۔ کھڑکیوں کی طرف بھاگے لیکن آگ کے مہیب شعلوں میں کودنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

کمرے کا ہر دروازہ اور ہر کھڑکی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے . . . . . لمحہ بہ لمحہ بھڑکتی ہوئی آگ کے خوفناک شعلے بڑی تیزی سے انکی طرف بڑھ رہے تھے۔ لپک رہے تھے۔ سرخ سرخ بل کھاتی ہوئی زبانیں نکالے ہوئے۔!!

دیواریں اور چھتیں جل جل کر گر رہی تھیں۔ آگ کا دریا چاروں طرف سے انہیں اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔

امیرزادہ خان اور ستارہ بائی مدد کے لئے چیختے اور چلاتے رہے۔ باہر جانے کیلئے راستے کی تلاش میں کمرے میں ادھر ادھر بھاگتے رہے مگر بے سود۔!

کسی کے لئے ان کی مدد کو پہنچنا ممکن نہ تھا۔

وہ چیخ چیخ کر بے دم ہو گئے۔

دھوئیں سے ان کا دم گھٹنے لگا۔

آگ اب ان کے چمکتے بھڑکتے ہوئے لباس کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔

موت اپنے خونی پنجے بڑھائے ان کی طرف لپک رہی تھی۔ ان کو دبوچ لینے کیلئے بے چین تھی۔ بے قرار تھی۔!!

وہ زمین پر گر کر تڑپتے رہے اور تھوڑی دیر بعد بیہوش ہو گئے۔ اور اس کے چند منٹ بعد کھیل ختم ہو چکا تھا۔

آگ پر قابو پانے اور امیر زادہ خان کے ساتھ ستارہ بائی کو بچانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔

وہ بھسم ہو گئے تھے . . . . . . ہڈیوں کے جلے ہوئے، اکڑے ہوئے ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

قدرت اپنا انتقام لے چکی تھی . . . . . اور شائد وہ بگلی النسائیہ بھی . . . . !!

اس چیخ و پکار اور افراتفری کے عالم میں جب گڑھی کے اکثر لوگ آگ پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھے وہ . . . . شعلوں سے دور ہٹ کر اکیلی کھڑی فلک شگاف قہقہے لگا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں زخمی شیر کی سی وحشت و درندگی تھی . . . . . ایک فاتح کی سی چمک . . . . . جو اپنے دشمن کو عبرتناک شکست دے کر اپنا انتقام پورا کر چکا ہو۔ !!

صبح طلوع ہونے والے سورج نے دیکھا کہ نسلوں پرانی یہ عظیم الشان تاریخی عمارت ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ انسان کے عروج و زوال کی ایک عبرتناک مثال بن گئی تھی . . . . . فانی دنیا کی بے ثباتی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ۔ !!

بگلی النسائیہ اب قدرے پرسکون نظر آتی تھی۔ چہرے پر اطمینان کی جھلک تھی اور وحشت و جنوں بھی کم ہو چکا تھا۔ کافی حد تک۔ !!

بظاہر بڑی عجیب سی بات تھی۔ لوگ حیران تھے۔

"آگ کیسے لگی۔ ؟؟"

"کس نے لگائی۔ ؟؟"

یہ سوال تقریباً ہر شخص کی زبان پر تھے۔ سبھی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ سوچ رہے

تھے اور ان کی معنی خیز نگاہیں بار بار انسانیہ کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔
بعض تو کھلم کھلا کہہ رہے تھے کہ "یہ اس پگلی انسانیہ کے علاوہ کسی اور کا کام نہیں ہے۔
اور کوئی یہ جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ امیر زادہ خان کے سارے ظلم و تشدد کے باوجود
اسکے خلاف اتنا بڑا اقدام کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف انسانیہ ہی کر سکتی
تھی.... اس حویلی اور اس جاگیر کی اصلی مالک۔!"

اور حقیقت بھی تو یہی تھی۔

سب کو سوتا پا کر جانے رات کے کس لمحے وہ سٹور میں پہنچی تھی۔ مٹی کے تیل سے بھرے
ہوئے کنستر کس مصیبت سے اٹھا اٹھا کر باہر لائی تھی..... انہیں حویلی کے دروازوں
اور کھڑکیوں پر چھڑکتی رہی تھی اور پھر ایک دردناک سسکی کے ساتھ... کتنی دکھ اور حسرت
بھری نگاہوں کے ساتھ.... اس نے اپنی بیٹی.... اپنی مغیرہ گل کی خوابگاہ کیطرف
دیکھا تھا جہاں امیر زادہ خان اور ستارہ بائی... زندگی کے ہر ہر لمحے سے خوشیوں اور
مسرتوں کا رس نچوڑ کر اس رات کو یادگار بنا دینے کی کوششوں میں مگن تھے۔

"دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔" کے مصداق انسانیہ کا جنون اس لمحے اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا
وہ دبے پاؤں آگے بڑھی۔ اس کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر اس نے سب سے
زیادہ تیل چھڑکا تھا۔ باقی کمروں کے برعکس اسکے سب دروازوں اور کھڑکیوں کو باہر سے
بند کر دیا تھا۔ سب کی کنڈیاں اور چٹخنیاں چڑھا دی تھیں اور پھر... کانپتے، لرزتے
ہاتھوں سے دیا سلائی جلا کر تیل کو آگ دکھا دی تھی۔ اپنے سینے میں دہکتے ہوئے جہنم کی
آگ سرد کرنے کا صرف یہی ایک راستہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

مغیرہ اور پردل خان کی دردناک اور اچانک موت . . . . امیرزادہ خان کی غیر اخلاقی حرکتوں اور انسانیہ کے دماغی توازن کھودینے کے بعد اس باعظمت اور باجبروت ، خاندان کا وقار مٹی میں مل گیا تھا ۔ رہی سہی کسر امیرزادہ خان کی موت اور حویلی کی تباہی نے پوری کردی اور یوں ایک تاریخی اہمیت رکھنے والے معزز خاندان کی نسل کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا ۔

دن بھر وہ پگلی . . . . اس اجاڑ اور ویران حویلی کے کھنڈرات میں اکیلی بھٹکا کرتی . . . کبھی خود بخود ہنستی ، کبھی روتی . . . . سسکیاں لیتی یا پھر چیخیں مارا کرتی تھی ۔ !!

بعض اوقات مکمل خاموشی کا دورہ بھی پڑتا ۔ ایسی حالت میں کئی کئی دن وہ گم سم سی اپنے خیالات کی دنیا میں کھوئی رہتی ۔ گھمبیر خاموشی ۔ ! کچھ سوچتی ہوئی آنکھیں ۔ !! ذہن مفلوج ہوجاتا تو حویلی کے کسی ویران گوشے میں پڑ کر سو جاتی . . . . یا گھنٹوں اسی عالم مدہوشی و بے خودی میں بھوکی پیاسی پڑی زمین پر لوٹیں لگاتی رہتی تھی ۔

بھوک پیاس ناقابل برداشت ہوجاتی تو وہ آبادی کی طرف نکل جاتی . . . . لوگوں کے گھروں کے اردگرد چکر لگاتی رہتی یا . . . . ان کے مکانوں کے اندر گھس جاتی ۔ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ۔ خود بخود بولتی رہتی ۔ عورتیں اس کی یہ حالت دیکھ کر اکثر کھانے پینے کی اشیاء اسکی جھولی میں ڈال دیا کرتی تھیں جنہیں وہ کسی لالچی اور حریص کتے کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے منٹوں میں چٹ کر جایا کرتی تھی ۔

گڑھی درآدم خان کی عمر رسیدہ عورتیں جو اسکے جوانی کے وقار اور ادھیڑ عمری کی عظمت سے آگاہ تھیں اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کرسکتیں ۔ بدبودار چیتھڑوں میں لپٹا ہوا سوکھا مارا جسم دیکھ کر قدرت کی ستم ظریفی اور بے مہرئ زمانہ کا گلہ کئے بغیر نہ رہتیں ۔

کئی مرتبہ انھوں نے اپنے کپڑے لالا کر انسانیہ کو پہنائے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو تھوڑی دیر بعد ہی انہیں چیر پھاڑ کر برابر کر دیا کرتی تھی ۔

لوگ اسے رحم بھری نظروں سے دیکھتے اور بعض رقیق القلب تو بھیگی ہوئی آنکھوں کے گوشوں کو صاف کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیوانی ان سب باتوں سے بے خبر اپنی راہ لیتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب سے بیگانہ ۔!! سب سے بے نیاز ۔!!

دنیا اور اس کے جھمیلوں سے بے پروا ۔ اپنے حال میں مست ۔ خوش اور مطمئن ۔!!

اس کے پاگل پن نے اسے اس دکھ بھری دنیا کے آلام و مصائب کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی ساری قوتوں سے محروم کر دیا تھا ۔

مسرت و خوشی ۔

غم و اندوہ ۔

خلوص و محبت ۔

رحم ، ہمدردی ۔

دوستی ، دشمنی یا رشک و حسد کا ہر انسانی جذبہ اس کے نزدیک اپنا مفہوم کھو چکا تھا ۔

امارت و غربت ، اونچ نیچ اور دکھ سکھ کے فلسفے سے بے پروا وہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھی ۔ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بیگانہ و اجنبی ۔!!

یونہی صبح و شام گذرتے چلے گئے ۔

طلوع و غروب کا سلسلہ جاری رہا ۔ اور موسم بدلتے رہے ۔ ہمیشہ کی طرح ۔!!

پندرھواں باب

ایک غیر ملک، اجنبی لوگ اور نئی جگہ ہونے کے باجود مطالعے میں غیر معمولی انہماک اور فطری ذہانت وقابلیت نے فواد کو بہت جلد وہ مقام دیا جو کوئی عام انسان ایک عمر گذرنے کے باوجود بھی حاصل نہیں کر پاتا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم ملازمت کا سلسلہ بھی چلتا رہا اور پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد وہ ایک امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر بن گیا۔ وہاں سے ایک دوست .... ایک انڈسٹریلسٹ کھینچ کر کاروباری دنیا میں گھسیٹ لایا اور چند سال میں دیکھتے ہی دیکھتے فواد اس کی فرم کا مینجنگ ڈائریکٹر بننے کے ساتھ ساتھ اسکے لمبے چوڑے کاروبار میں حصہ دار بھی بن گیا۔

اس نے محنت کی۔ صلاحیتیں خداداد تھیں اور ترقی کے تمام مواقع میسر — !! کاروبار پھیلتا گیا اور دولت کی ریل پیل کے ساتھ زندگی کی ہر آسائش فواد کو میسر ہوتی چلی گئی۔ اب وہ اونچی سوسائٹی کا ایک ذمہ دار فرد تھا۔ ماڈرن لائف کے سارے لوازمات اور ہر سہولت اسے حاصل تھی۔ وہ کروڑپتی بن گیا کیونکہ کاروبار میں شرکت کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کا پارٹنر ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے وارثوں کو کاروبار کے منافع میں مناسب حصہ مل رہا تھا اس لئے انہوں نے فواد کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے سب اختیارات بخوشی اسے سونپ دیئے ان کے خیال میں فواد ان کے مفادات کا بہترین

محافظ تھا۔ وہ خود صرف سیلپنگ پارٹنر تھے۔ اور فواد اس لمبے چوڑے کاروبار کا مالک ونگران۔!!

اسکی انتھک محنت اور کامیابی وکامرانی نے اسکے والدین اور بھائی بہنوں کے لئے اونچی سوسائٹی کے دروازے کھول دیئے۔ اب وہ آسودہ حال اور مسرور ومطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ اعلیٰ اسکولوں کالجوں میں تعلیم پا رہے تھے اور اپنے ایثار پسند بھائی پر بجا طور پر نازاں تھے۔ وہ بھائی . . . . جو وطن سے ہزاروں میل دور مغربی سوسائٹی کی دنیائے رنگ وبو میں رہتے ہوئے بھی انہیں بھولا نہیں تھا۔ ان کے روشن مستقبل اور خوشحال زندگی کے لئے دن رات جدوجہد کر رہا تھا۔ اور جس کے مضبوط وتوانا بازؤں کے سہارے غربت وتنگدستی اور آلام ومصائب کے بھنور سے نکل کر اب وہ ایک پرسکون اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ معاشرے میں ایک باعزت مقام کے مالک تھے۔!!

گندی سی گلی کے ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے اور تنگ وتاریک کرائے کے مکان میں رہنے کی بجائے اب شہر کے بہترین علاقے میں انہوں نے ایک خوبصورت اور ماڈرن وضع کی کوٹھی بنوالی تھی جس میں جدید سامان آرائش کے ساتھ ساتھ زندگی کی ہر آسائش کا سامان بھی موجود تھا۔

کاریں تھیں۔ نوکر چاکر تھے اور ہنستے مسکراتے زندگی کی روشنی سے منور شاداب چہرے تھے۔ وہ چہرے جن پہ سکون وطمانیت تھی شگفتگی تھی۔ خوشحالی کی چمک اور صحت وزندگی کی سرخی تھی۔ اور اس سرخی میں . . . . فواد کے خون اور پسینے کی آمیزش تھی۔

اپنی ان تھک محنت سے، جگر کا خون دے دے کر وہ ان کمزور پودوں کو چھتنار اور تناور درختوں میں تبدیل کر رہا تھا۔ ایسے مضبوط اور سایہ دار درختوں میں.....
جن کے ٹھنڈے سائے میں حوادثات زمانہ کی تیز دھوپ سے نڈھال مسافر اپنی ساری تھکن اور تکلیف بھول کر ایک گہرا سکون، فرحت اور ٹھنڈک محسوس کرتا ہے

سال پر سال بیت، گئے!!

ماہ و سال کی گردش کے ساتھ فواد کے بھائی تعلیم سے فارغ ہو کر اعلےٰ عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ ملک کی آرمی اور سول سروسز میں ذمہ دار آفیسرز بن گئے تھے۔

بوڑھے والدین کی مضبوط لاٹھی ــ اور

بہنوں کے لئے باعث فخر و ناز ــ!!

بہنوں نے تعلیم مکمل کی تو شاندار جہیز کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے معقول اور کھاتے پیتے صاحب ثروت گھرانوں میں ان کی شادیاں کر دی گئیں۔ فواد کی محنت اور جد و جہد ان کی زندگی میں خوشیوں، مسرتوں اور ازدواجی راحتوں کا پیغام بن کر آئی تھی۔ ان کی مانگ کا سیندور بن کر ــــ!! وہ سب اپنے اپنے گھروں میں آسودہ حال تھیں اور زندگی سے مطمئن ــ!!

فواد اب مستقل طور پر امریکہ کا شہری بن چکا تھا۔ اس کا کاروبار بے حد وسعت اختیار کر رہا تھا۔ امریکہ کی تمام ریاستوں کے علاوہ کئی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے دفاتر اور ایجنسیاں قائم ہو چکی تھیں۔

فواد کے صرف دو مشاغل تھے۔

کاروبار اور فرصت کے وقت مطالعہ ــ!!

ضعیف والدین اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئے تھے ۔ ماں کو اسکے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو بے چین رکھتی ۔ بھائی خطوں پر خط لکھتے ۔ چھوٹے ہونے کے باوجود گھر آباد کرنے کی نصیحتیں کرتے ۔ بہنیں اپنے طویل اور محبت بھرے خطوط میں چاند سی بھابی لانے کی خواہش کا اظہار کرتیں لیکن نواد . . . . . وہ تو شائد زندگی بھر کنوارہ رہ کر عمر یونہی گزار دینے کا تہیہ کر چکا تھا ۔ اسی لئے تو وہ گھر سے آنے والے ایسے تمام خطوط کے جواب ہمیشہ گول کر جایا کرتا تھا ۔

ماں اس کا دکھ سمجھتی تھی لیکن بیٹے کے دل پر لگنے والے گھاؤ کا علاج اسکے بس کی بات نہ تھی ۔

بہنیں کوشش کر کے تھک ہار گئی تھیں ۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شادی کے لئے تقاضا یا اصرار بھائی کے نزدیک اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے اور اب وہ اپنے خطوط میں اس ذکر سے بھی احتراز کرنے لگی تھیں حالانکہ ان کے خیال میں اس روگ کا واحد علاج بھی شادی ہی تھا ۔

"بھیا ۔ ! اب ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے ۔ بس آپ ہمارے لئے ایک سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی میم بھابی لیکر پاکستان چلے آئیے ۔ !"

سب سے چھوٹے بھائی نے انتہائی معصومیت سے اس کے زخموں کو کرید ڈالا تھا ۔

"نیلی آنکھیں ۔ سنہری بال ۔ !!"

خط کی آخری سطر پڑھ کر وہ کچھ کھو سا گیا ۔ ماضی کے دھندلکوں میں ۔ مغیرہ کی ایک ایک بات . . . . . ایک ایک یاد اسے ڈستی رہی . . . . . ! نیلی آنکھیں . . . . سنہری بال . . . . . مغیرہ کا سراپا . . . . . ملکۂ کوہسار کی تمکنت اور گڈمڈ سے خیالات ۔ !!

آج برسوں گذرنے کے باوجود بھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب کچھ کل کی بات ہو۔
اور وہ تمام رات اس نے کروٹیں بدل بدل کر گذار دی ۔۔۔۔۔ اس کا احساس تنہائی کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔!!

"کاش ۔۔۔۔ یہ مادی وسائل ۔۔۔۔ سونے چاندی کے کھنکتے ہوئے سکوں کی یہ جھنکار میری روح کا خلا پر کرسکتی ۔۔۔۔۔ مجھے روحانی اور ذہنی سکون بہم پہنچا سکتی ۔۔۔۔ پر ۔۔۔۔ پر یہ جنس گراں تو دنیا کے بازاروں میں نایاب ہے ۔۔۔۔ انسان تمام عمر اسکی تلاش میں بھٹکنے کے باوجود بھی اسے حاصل نہیں کر پاتا کہ اس کا سرچشمہ تو اسکی اپنی روح کے اندر ہی کہیں موجود ہے ۔۔۔۔۔ اور میری روح کے یہ سوتے تو بہت پہلے ۔۔۔۔ عین عالم شباب میں خشک ہو گئے تھے اور ۔۔۔۔ اب تو زندگی کے اس بے آب و گیاہ صحرا میں دور دور تک کسی نخلستان کا سراغ نہیں ملتا ۔۔۔۔۔۔!! کسی حقیقت پسند انسان کی طرح وہ خود ہی اپنا نفسیاتی تجزیہ کر رہا تھا۔

"اوہ ۔۔۔۔ خدایا۔ !!" اس نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیکر سر تکیئے پر پٹخ دیا "اُف ۔۔۔۔ !آہ ۔۔۔۔ !!" ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود وہ کراہ رہا تھا۔ کسی دکھی بچے کی طرح۔!!

"ننھے بھائی۔ !کاش تم لوگوں کی یہ خواہش پوری کرنا میرے اختیار میں ہوتا۔ !" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

اور وہ تمام رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی ۔ صبح تک پلنگ کے پاس رکھی ہوئی ایش ٹرے سگرٹ کے لاتعداد ٹکڑوں اور راکھ سے بھر چکی تھی۔

"سر۔! آپ کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ چہرہ بھی اترا اترا سا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔؟" صبح آفس میں اس کی پرائیویٹ سیکرٹری نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"ٹھیک ہوں میں۔!" مختصر سا جواب دیکر وہ فائلوں کے انبار میں گم ہو گیا۔

"میں آپ کے لئے چائے یا کافی بنا لاؤں۔؟" اس نے پوچھا۔

"ہوں.... ایک کپ۔ میرے سر میں بہت درد ہے۔ کافی کے ساتھ کوئی سر درد کی ٹیبلٹ بھی لے آئیں تو اچھا ہے۔"

اس نے سر اوپر اٹھایا تو سیکرٹری نے دیکھا کہ اس کے زرد چہرے پہ درد و غم کی لہریں کسی اندرونی تکلیف اور کرب کا خاموش فسانہ کہہ رہی تھیں۔ فواد کا یہ دکھی لہجہ... یہ پراسرار سا رویہ... اور چہرے پر پھیلا ہوا اضطراب و اضمحلال کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ اس کی لیڈی سیکرٹری نے فواد کا یہ موڈ بارہا دیکھا تھا.... اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کی تھی...... اس کے متعلق پہروں سوچا تھا.... کچھ پوچھنا چاہا تھا لیکن..... فواد کا ریزرو سا سرد لہجہ، بیگانگی اور اجنبیت دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ "کیا معلوم وہ اسے اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت سمجھ کر اس کی بات کا برا مان جائے...... اسے ڈانٹ دے یا پھر سروس سے جواب.....!!"

اور وہ خاموشی میں ہی عافیت سمجھ کر اسے تنہا کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل جاتی۔

پرائیویٹ سیکرٹری کے علاوہ فواد کے آفس میں اور بھی کئی لڑکیاں تھیں جو مختلف قسم کی ڈیوٹیز انجام دیتی تھیں۔ ان لڑکیوں میں کئی نوخیز حسینائیں تو اپنے ناز و ادا، حسن و جمال اور جسمانی کشش کے باعث سوسائٹی کی روح رواں سمجھی جاتی تھیں اور ماڈرن

سوسائٹی کے بہت سے نوجوان پہروں ان کے ایک اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے تھے۔ ایک وسیع کاروبار کے مالک، اعلیٰ تعلیمیافتہ، دولت مند کنوارے باس کو دیکھ کر نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی کئی رنگین تتلیوں نے نگاہوں کے تیر چلائے۔ دلفریب اور مسحور کن اداؤں کے جادو جگائے ...... شوخ و شنگ مسکراہٹوں کے بیباک پیغام دیئے لیکن کوئی بھی تو اس کے من مندر کے سنگھاسن پر سجائی ہوئی مورتی کو توڑنے یا اسے باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

مغیرہ گل..... اس کے خانۂ دل میں مکین تھی۔ بڑی ہی مستقل مزاجی کے ساتھ۔ اس کا آئیڈل بن کر۔!

اسکے دل و دماغ اور ہوش و حواس پر قابض تھی اور وہ.... اپنی زندگی کے پہلے پیار کو آخری سمجھ کر ایک وفادار پجاری کی طرح اس کی پرستش کیئے جا رہا تھا۔ ساری عمر یونہی بتا دینے کا عہد کر چکا تھا۔

فواد فرشتہ تو نہ تھا.... ایک انسان تھا..... مٹی کا جیتا جاگتا اور مکمل مرد۔!

اس کے اردگرد بسنے والی گلیمرس قسم کی حسینائیں اپنی بیباک مسکراہٹوں کے ساتھ اداؤں کے جال پھیلاتیں تو کسی وقتی اور عارضی جذبے سے مغلوب ہو کر یا بعض اوقات تنہائی سے گھبرا کر سکون کی تلاش میں وہ ان کی طرف مائل بھی ہو جاتا۔ ان کے اصرار پر ان کے ساتھ کسی ہوٹل یا کلب میں چلا جاتا اور ان کی خواہش کے احترام میں ڈانس کے لئے بھی تیار ہو جاتا لیکن..... کچھ دیر بعد ہی..... اس کے روح کا خلا اس کے اور اس کی ساتھی لڑکی کے درمیان حائل ہونے لگتا..... دماغ پر ایک دھند سی چھانے لگتی اور اس دھند سے چہرے نمودار ہوتے...... مغیرہ گل کے چہرے۔

کئی روپ، کئی رنگ۔

ہنستے مسکراتے ہوئے۔ اپنی تمام تر رعنائیوں اور جاذبیتوں کے ساتھ۔ دلکش مسکراہٹوں سے منور چہرے۔ یا پھر......

اداس اداس، کھوئے کھوئے اور بجھے بجھے چہرے۔

جن پر بھیگی بھیگی پلکوں کی چلمن کے پیچھے سے کچھ کہتی، کچھ یاد دلاتی ہوئی، گلے شکوے اور شکائتوں سے بھرپور آنکھیں دیکھ کر فواد کے سارے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔

ڈانس کرتے کرتے اپنی ہم رقص لڑکی کے گرد اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی۔ آرکسٹرا کی مدہوش کن دھنوں پر تھرکتے ہوئے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ جاتے اور.... اور وہ اپنی ساتھی لڑکی کو پرے دھکیل کر ڈانسنگ ہال یا بال روم سے باہر نکل جاتا۔ بڑی تیزی کے ساتھ۔!!

بیچاری لڑکی توہین کے شدید احساس کے ساتھ ہونٹ کاٹ کر رہ جاتی۔ وہ اس کے جذبات و احساسات کی پروا کئے بغیر کار سٹارٹ کر کے چل دیتا۔ شہر اور شہر کے ہنگاموں سے دور۔ کسی ویرانے میں..... کسی دریا، جھیل یا سمندر کے کنارے۔ تنہائی اور مسرت کی تلاش میں۔ اپنے لٹے ہوئے روحانی اور ذہنی سکون کی تلاش میں۔!!

وہ پہروں بھٹکتا۔

خود سے باتیں کرتا۔

مغیرہ سے ہمکلام ہوتا۔

گلے شکوے اور شکائتیں۔ اسکی جذباتیت اور جلدبازی کی شکایت۔ زندگی

کے طویل اور کٹھن سفر میں اسے تنہا چھوڑ جانے کا گلہ یا پھر۔۔۔۔ ظالم سماج کے بے رحم رسوم و قیود اور بے مہریٔ زمانہ کا شکوہ ۔!!

رات گئے وہ واپس آتا۔ بھوک پیاس اور تھکن کا احساس کئے بغیر بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہتا اور خواب آور گولیاں کھانے کے باوجود ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتا۔

صنفِ نازک سے اس کی بے اعتنائی اور سرد مہری دیکھ کر اکثر دوست اسے سمجھاتے۔ ایک نارمل انسان کی طرح زندہ رہنے اور زندگی کی راحتوں سے لطف اندوز ہونے کی ہدایات دیتے جس پر وہ محض ہنس کر خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ ایک کھوکھلی ہنسی۔!!

اسکی ان عجیب و غریب حرکات و عادات کی وجہ سے اس کی ماتحت لڑکیاں دبی دبی زبان میں اسے "کریک" ابنارمل اور مینٹل کیس۔! کے خطابات سے نواز چکی تھیں۔ کام کے علاوہ انہوں نے اس کی ذات میں دلچسپی لینے کا خیال بالکل ترک کر دیا تھا۔ کون ایک پتھر کے ساتھ سر پھوڑے۔!

مگر وہ ان سب باتوں کی پروا کب کرتا تھا۔؟؟؟ اسکی ساری صلاحیتیں اور ذہانت اسکے خاندان، بوڑھے والدین اور بھائی بہنوں کے مستقبل کو روشن و تاباں بنانے کے لئے وقف ہو چکی تھی۔

وہ جی رہا تھا محض دوسرے کے لئے۔۔۔۔ ان کے سکھ چین اور خوشیوں کی خاطر۔۔ ۔۔۔ لیکن پتہ نہیں کیوں سب گھر والوں کے بے شمار خطوط، ان کی منت و سماجت اور پند و نصائح کے جواب میں وہ اپنے وطن لوٹنے سے گھبراتا تھا۔

شائد اس لئے کہ اس کرم خوردہ سوسائٹی کے شکار ایک زخمی اور دکھی سے کمزور انسان میں اس قدامت پسند ماحول کی سفاک روایات کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

اسکے طبقاتی امتیازات اور جابر قوانین کو ختم کرنا اسکے بس کی بات نہ تھی۔ وہی قوانین، سرمایہ داری اور اونچ نیچ کے امتیازات جو..... اسکی زندگی کی خوشیوں کو زہریلے ناگ بن کر ڈس چکے تھے۔ اس کی روح کے اندر خلوص و وفا کے ہر خوبصورت جذبے کو جلا کر راکھ کر چکے تھے۔!

وہ مشرقی معاشرے کی گھٹن اور اسکی تباہ کن فرسودہ رسوم و روایات سے متنفر تھا۔

باغی۔ یا ان سے خوفزدہ ...؟؟؟

یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔

سولھواں باب

گذشتہ کئی راتوں سے فواد ایک عجیب و غریب خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا خواب ۔!!!

یہ حیرت کی بات ہی تو تھی کہ عرصۂ دراز کے بعد خواب میں اسے دو وجود مسلسل نظر آرہے تھے اور وہ بھی اکٹھے ۔ساتھ ساتھ۔!!

وہ دو وجود۔ . . . . جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے ۔پوتر . . . . . اور محبوب ترین وجود۔ ماں اور مغیرہ . . . . . ! مغیرہ اور ماں ۔! دونوں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں ۔ہونٹوں پر ایک دلآویز اور دلکش مسکراہٹ لئے ۔ اس سے اپنے ملک لوٹ آنے کی التجائیں کر رہی تھیں ۔ اس کی منتظر تھیں . . . . . اسکے لئے چشم براہ ۔!! ان کی بے چینی، بیقراری اور کچھ کہتی ہوئی آنکھوں کا پیغام واقعی فواد کی سمجھ سے بالاتر تھا ۔ !و ۔یران تھا کہ کہاں مغیرہ اور کہاں ماں . . . . . !! ایک زندہ اور دوسرے مردہ وجود کی اس یکجائی اور ملاپ کا مقصد کیا ہو سکتا ہے ۔ ؟؟؟

اس کا ذہن قربت اور یگانگت کے اس انوکھے مظاہرے کو مختلف معنی پہنا رہا تھا۔ گھر سے آنے والے آخری خط میں چھوٹے بھائی نے ماں کی شدید علالت ضعیف العمری اور موت سے پہلے فواد کو ایک نظر دیکھ لینے کی شدید آرزو اور تمنا کا اظہار بڑے ہی موثر اور جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے انداز میں کرنے کے بعد اس سے وطن واپس آنے کی درخواست کی تھی ۔ اس نے لکھا تھا۔

"فواد۔! میرے عظیم بھائی۔!

یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا دردمند اور حساس انسان بھی اتنا سنگدل اور کھوٹا ثابت ہو سکتا ہے کہ بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی ماں کی آہ و زاری، آنسو، آہیں اور التجائیں سن کر بھی اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ اتنا بے حس بن جائے۔ اندھا، گونگا اور بہرہ۔!!

بھیا۔!

مجھے اس تلخ نوائی کے لئے معاف کر دینا۔ آج پہلی بار میرا دل اور قلم قابو میں نہیں۔ ماں جی کی حالت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر ان کی زندگی بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اور ... وہ آپ کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا میں موت کے ساتھ جنگ کر رہی ہیں ... تڑپ رہی ہیں ... بلک رہی ہیں ... دن رات آپکے لوٹ آنے کی دعائیں کرتی رہتی ہیں اور اب ... اب تو روتے روتے ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے بھی خشک ہو چکے ہیں۔!!

بھائی جان۔!

آپ کے انتظار میں ماں جی کی آنکھیں ہر وقت دروازے پر جمی رہتی ہیں۔ ہر آہٹ اور ہر آواز پر وہ چونک اٹھتی ہیں ... ایک عجیب سے جنون اور وارفتگی کے عالم میں ڈاکیے کی آمد کا انتظار کرتی ہیں ... وہ ڈاکیا جو دور دیس سے ان کے پہلوٹھی کے اور شاید سب سے محبوب بیٹے کی آمد کا حیات بخش سندیسہ لے کر آئے گا۔ ان کی خزاں رسیدہ زندگی کے لئے خوشیوں، راحتوں اور بہاروں کا پیامبر بن کر۔!!

فواد بھائی۔! اگر آپ کو ہمارے جذبات و احساسات اور التجاؤں کی پروا نہیں تو

ماں جی کا ہی کچھ خیال کر لیجیئے، اور یہ مت بھولیئے کہ آپ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کیلئے ہر لمحہ دست بدعا رہنے والی ماں اب چراغ سحری ہے ..... اور بھلا چراغ سحری کا کیا بھروسہ .....؟ کسی لمحے بھی گُل ہو سکتا ہے . . . . .!! ہاں آپ کی آمد شائد اس گل ہوتے ہوئے چراغ کو بجھنے سے بچا سکے۔ اسے نئی زندگی بخش دے۔

فواد۔! میرے عزیز ترین بھائی۔!!! آپ کب آئیں گے۔ . . .؟!؟"

"اوہ .... تو کیا مغیرہ کی طرح ماں جی بھی . . . .؟!؟"

خط پا کر فواد سہم گیا۔ طرح طرح کے وہم، اندیشے اور وسوسے اسکا دل دہلا رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔

"ماں کی موت ......؟" اف۔! تصور ہی کتنا ہولناک تھا۔

"کچھ ہو رہا ہے۔

کچھ ہونے والا ہے۔

کوئی حادثہ۔؟ کوئی واقعہ۔؟

کوئی انقلاب۔!!"

اس کی چھٹی حس اسے بار بار احساس دلا رہی تھی۔!!

وہ بے حد اپ سیٹ تھا۔ کسی کام میں دل ہی نہ لگ رہا تھا اور جب کئی دن تک بہلانے کی ہزار کوشش کے باوجود بھی طبیعت سکون پذیر نہ ہوئی تو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو بالائے طاق رکھ کر ..... کبھی پاکستان نہ جانے کے پختہ عہد کو توڑ کر اس نے اپنے اسسٹنٹ کو بلایا۔ اس سے مشورہ کیا اور اپنی فرم کی ایک برانچ پاکستان میں کھولنے کے انتظامات کی ہدایات دیکر خود رخت سفر باندھ لیا۔ اپنا کاروبار اور فرائض اپنے

اسسٹنٹ کو سونپ کر۔!

اس کی آمد کا ٹیلیگرام پاکر ماں کی زندگی کی بجھتی ہوئی شمع میں جیسے پھر سے جان پڑ گئی۔ کاغذ کا یہ چھوٹا سا پرزہ اسکے لئے ڈاکٹرز کے ہزار انجکشنوں اور ٹانکوں سے زیادہ مفید اور زود اثر ثابت ہوا تھا۔ اس کی صحت دن بدن سنبھل رہی تھی اور فواد کی آمد کے دن تک وہ اس قابل ہو چکی تھی کہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ ائیرپورٹ پر اپنے پردیسی بیٹے کا استقبال کر سکے۔ خواہ دوسروں کے سہارے چل کر ہی سہی۔!!

بھائی بہن فواد کو دیکھتے ہی کھل اُٹھے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک آنسوؤں میں ڈھل رہی تھی...... آنسو جو خوشی اور غم دونوں موقعوں پر انسان کے اندرونی جذبات واحساسات کے خاموش مگر سچے ترجمان کا کام انجام دیتے ہیں۔

ماں کے کمزور بازو پھیل گئے۔ ایک شوق، وارفتگی اور بیقراری کے عالم میں ماں بیٹا ایک زمانے کے بعد پھر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ماں کی سسکیاں تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ اس کے لرزتے اور کانپتے ہوئے ہاتھ جوان، وجیہہ اور اونچے لمبے بیٹے کے چہرے کو ٹٹول رہے تھے اور روح.... وہ تو جیسے کھنچ کر ان کمزور اور لرزتے ہوئے بوڑھے ہاتھوں میں سمٹ آئی تھی۔!!

برسوں کی ترسی ہوئی ممتا نے تڑپ کر بیٹے کو سینے سے لگالیا۔ اس کی پیشانی کو چوما۔ دیوانہ وار... !! اور پھر جتنی دعائیں اسے یاد تھیں ایک ہی سانس میں دے ڈالیں۔ ماں سے فارغ ہو کر وہ باپ سے گلے ملا اور اسکے بعد بھائی، بہنوں اور بھابیوں کی باری

آئی۔ خوشی کے آنسوؤں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کے جلو میں ایک پر جوش استقبال کے بعد اس مختصر سے جلوس کی معیت میں فواد گھر آیا۔

وہ خوش تھا اور حیران بھی . . . . یہاں تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ہر چیز خوشحالی، تعمیر و ترقی اور ارتقار کی مظہر۔!

روشن، کشادہ اور اجلا اجلا گھر۔

خوبصورت اور قیمتی ساز و سامان۔

بہترین ڈیکوریشن۔

خوشگوار ماحول . . . . اور افراد خانہ کی نکھری نکھری اور پیاری پیاری شخصیتیں۔!!

وہ مسرور تھا اور نازاں بھی۔ کہ ان پر اعتماد اور پیاری شخصیتوں کو بنانے، سنوارنے اور انہیں معاشرے میں ایک بلند مقام دلوانے کے لئے اس نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا۔ جگر کا خون دے دیکر پالے ہوئے یہ بوٹے اب پھلدار اور گھنے درختوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور ان تناور درختوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک عجیب سی راحت بخش آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ باغبان خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اسکی محنت بار آور ہو چکی تھی۔ ہرے بھرے اس باغ کو دیکھکر . . . وہ مطمئن تھا کہ زندگی یونہی بیکار ضائع نہیں ہوئی تھی۔!!

ماں اور بہنیں اسکے لئے چاند سی دلہن کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہی تھیں۔ انکا بس نہ چلتا تھا کہ وہ شام سے پہلے پہلے فواد کو دولہا بنا ڈالیں۔ فواد نے لاکھ منع کیا لیکن ماں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس سلسلے میں وہ اب اسکی ایک بات نہ سنے گی بلکہ اپنے مادرانہ حقوق کو استعمال کرتے ہوئے اسکا گھر آباد کر کے رہیگی۔ اپنی آنکھیں بند ہونے سے قبل وہ اسے شاد و آباد دیکھنا چاہتی تھی نا۔

خوش و خرم اور بیوی بچوں میں گھرا ہوا ۔۔ !!

ابتدائی چند روز تو فواد کی آمد کی خوشیاں منانے، دعوتیں، پارٹیاں اٹینڈ کرنے اور ملنے ملانے میں گذر گئے لیکن جب رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی تو فواد کا جنوں پھر شدت اختیار کرنے لگا۔

عجیب و غریب خواب پھر سے شروع ہو گئے تھے۔ مغیرہ اکثر خوابوں میں دکھائی دیتی۔ کچھ کہتی ہوئی آنکھیں۔ ایک مبہم مبہم سا پیغام لیئے۔ !!

وہ مضطرب تھا اور بے چین بھی۔

ذہنی و روحانی کرب میں مبتلا۔

کھویا کھویا اور پریشان سا۔ !!

کافی سوچ بچار کے بعد اس ذہنی اذیت سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ اسکی سمجھ میں آیا کہ وہ مغیرہ کی قبر پر جا کر حاضری دے۔

دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسکے قدم دیار محبوب کی طرف اٹھنے لگے۔ خود بخود۔

بلا ارادہ ۔۔ !!

گڑھی ذر آدم خان کے قریب پہنچ کر صحیح سمت کا تعین کرنے کے لئے فواد نے صرف چند منٹ کے لئے کار روکی۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر کسی سے کچھ پوچھے بغیر کار کا رُخ صحیح راستے کیطرف موڑ دیا۔ اسے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ جذبۂ دل آپ ہی آپ اس کی رہنمائی کرتا ہوا اسے کھینچے لئے چلا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ حیران و ششدر سا حویلی کے گیٹ کے سامنے کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کھنڈر کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات لمحہ بہ لمحہ رنگ

بدل رہے تھے اور وہ ٹکٹکی باندھے ان ویران سے در و دیوار کو گھورے جا رہا تھا۔
فواد کے لئے یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع تھا۔ اس انجام کا تو وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اپنے وقت کی یہ عظیم الشان اور قلعہ نما عمارت جل جلا کر اب آثار قدیمہ کا روپ دھار چکی تھی۔ صدیوں پرانی کسی تباہ شدہ تاریخی عمارت کی طرح۔!! جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے۔ ادھ جلی چھتوں کے جھلسے ہوئے شہتیروں اور ستونوں میں ابابیلوں، الوؤں اور دوسرے حشرات الارض نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ دیواروں پر اور چھتوں کے ساتھ مختلف قسم کے پرندوں کے گھونسلے، کونوں کھدروں میں جنگلی چوہوں اور سانپوں کے بل، بے پناہ گرد و غبار اور ہر طرف چھائی ہوئی ہولناک ویرانی کسی آسیب زدہ جگہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس وحشتناک اور غیر معمولی خاموشی میں انسان اپنے دل کی دھڑکنیں تک گن سکتا تھا۔
آس پاس کی آبادیوں میں اس جنگل اجاڑ حویلی اور اس کے گرد و نواح میں جنوں، بھوتوں اور بدروحوں کے بسیرے کے متعلق افواہیں عام تھیں۔!!
مغیرہ گل کی موت پر فواد نے اس حویلی کو اپنی اصلی حالت میں آباد بھی دیکھا تھا پر دل خان کی زندگی میں شان و شوکت کا عالم ہی کچھ اور تھا۔
اور آج ..... باغ میں جھرنے کے کنارے مغیرہ گل کی قبر کے ارد گرد خود رو پودوں جنگلی بیلوں، درختوں، جھاڑ جھنکاڑ اور بے تحاشا اگی ہوئی لمبی لمبی گھاس پھونس کی وجہ سے اس قطعۂ زمین پر کسی گھنے جنگل کا گمان گذرتا تھا۔ ایک ایسے وحشت ناک جنگل کا جس میں برسوں سے کسی انسان کا گذر تک نہ ہوا ہو۔
"یہ سب کیا ہوا۔؟ کیسے ہوا۔؟؟ اس حویلی کے مکین کہاں گئے۔؟؟؟"

سوچ سوچ کر فواد کی عقل جواب دے گئی۔

وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کس سے پوچھوں۔؟ کون بتائے۔؟؟ یہ عبرتناک انجام۔؟؟"

اچانک اس نے ایک چیخ سنی۔ چیخ جس میں دہشت تھی۔۔۔۔ اور دیوانگی۔!

وہ وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بغور سننے لگا۔

مسلسل چیخوں کی آواز جھیل کی طرف سے آ رہی تھی۔ فواد کے قدم خود بخود جھیل کیطرف اٹھنے لگے۔ تیز تیز۔!!

آواز نمایاں اور واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب سے تذبذب کے عالم میں وہ قدم قدم بڑھتا گیا۔ آواز کی سمت۔!!

انسانی چیخیں۔ نسوانی چیخیں۔!

دہشت ناک اور دردناک چیخیں۔!

قہقہے۔۔۔۔ وحشیانہ قسم کے۔۔۔۔ دل ہلا دینے والے۔!!

فواد کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اب وہ انسانیہ کی جھونپڑی کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ آواز اندر سے آ رہی تھی۔

سب مصلحتوں اور اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ آگے بڑھا۔ اندر جھانکا۔

چیتھڑوں میں لپٹی وہ پگلی۔۔۔۔ انسانیہ ایک دیوار کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک میلی کچیلی تصویر کے سامنے جو ایک غلیظ سے دھاگے کے ساتھ بندھی ہوئی دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

قدم اُٹھے۔ آہستہ آہستہ۔!!

وہ بڑھیا کے برابر جا کھڑا ہوا۔

پہلی نگاہ تصویر پر پڑی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ دل کی دھڑکنیں جیسے تھم سی گئی تھیں۔ ایک عالم حیرت و استعجاب میں وہ کبھی تصویر اور کبھی سر سے پاؤں تک بڑھیا کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کا موازنہ کر رہا تھا شائد۔!!

بڑھیا کے جھاڑیوں کی طرح الجھے ہوئے سفید بال...... خزاں رسیدہ چہرے پر جھریوں کا جال...... بڑی بڑی نیلی آنکھیں...... ان کی ویرانی اور چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت و مظلومیت ایک طویل دکھ بھری زندگی کی المناک داستان سنا رہی تھی۔

زمانے کے آلام و مصائب، بھوک ننگ اور پاگل پن نے انسانیہ کے ہوش و حواس چھین کر اسے ایک تصویر عبرت بنا دیا تھا لیکن بغور دیکھنے والے کو اس کے کھنڈر جیسے چہرے کے رُعب و جلال میں ایک روشن و تابناک ماضی کی عظمت کی جھلکیاں اب تک نظر آ سکتی تھیں۔

پگلی کے خط و خال اور چہرے کی کاٹ میں مغیرہ گل کے نقوش کی ہلکی سی مشابہت ابھی تک باقی تھی۔ اسے پہچاننے میں فواد کو زیادہ دیر نہ لگی..... کسی سے کچھ پوچھے اور معلوم کئے بغیر ہی وہ کسی نہ کسی حد تک واقعات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

مغیرہ گل کی موت کے بعد فواد کا گڑھی دِر آدم خان میں آنا...... مغیرہ کی قبر پر ایک پریشان حال اور پاگل بڑھیا کی موجودگی اور..... پردل خان کو دیکھ کر جنون و وحشت کا زبردست دورہ.....!!

اس کے دماغ میں ایک فلم سی چل رہی تھی۔ بڑی واضح اور صاف ـــــ!!

دل کے تمام زخم ہرے ہو گئے تھے۔

آنسوؤں کے ساتھ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے پاگل بڑھیا کو دیکھا.... مغیرہ گل کی ماں کو.....!!

اس کے ماضی کی عظمت اور شان و شوکت کے منظر اس کے ذہن کے پردے پر ابھرتے گئے...... اس تغیر پذیر زمانے کی سفاکی دبے ثباتی کا یہ روپ دیکھکر فواد کے دل کے تار کچھ اس زور سے جھنجھنائے کہ مارے درد و کرب کے سسکیاں ضبط کرنی مشکل ہو گئیں۔

وہ انسانیہ کے برابر کھڑا تھا..... مغیرہ کی گرد آلود تصویر کے بالکل سامنے.....!! گھٹی گھٹی چیخوں کو حلق میں دبائے..... ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ہوئے...... مگر کب تک۔؟؟؟

دل سے اُٹھنے والا دھواں آنسوؤں کی برسات ساتھ لیکر آیا تھا۔ آنسو چپکے چپکے بہہ رہے تھے۔ قدرت کی ستم ظریفی اور بے نیازی کے اس انوکھے مظاہرے کو دیکھ کر اس کا دل کسی طرح قابو میں نہ آ رہا تھا اور وہ پگلی انسانیہ......اس عجیب و غریب اجنبی کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی..... سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ حیرت بھری اور پھٹی پھٹی وحشت زدہ نگاہوں کے ساتھ! وہ اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی تھی..... کچھ سوچ رہی تھی..... اپنے سارے پاگل پن کے باوجود۔!!

ایک دھندلا سا خیال...... ایک سایہ سا اس کے ذہن کی سکرین پر لہرایا۔ .....اسے کچھ یاد آ رہا تھا۔

کچھ تصویریں۔ ۔ ۔ مغیرہ گل کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ۔!! اور پھر ایک بھولی بھٹکی کہانی۔

اس کے تانے بانے۔ اس کے نمایاں کردار۔

سبھی تو گڈمڈ سے ہو کر رہ گئے تھے۔!!

وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک تباہ کن اور المناک داستان کے اس مرکزی کردار کو دیکھ کر اندرونی کرب اور بے چینی و بیقراری کی لہریں اسکے جھریوں زدہ پیلے پھٹک چہرے پر پھیل گئی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ اور ٹوٹا پھوٹا کمزور وجود بید مجنوں کیطرح لرز رہا تھا۔

شعور لاشعور پر غالب آرہا تھا۔ وہ اسے پہچان چکی تھی۔ دیوانے سے نادانستہ فرزانگی کی حرکت سرزد ہوئی تھی کہ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں کا دکھ ایک تھا۔

غم مشترک تھا۔

اور اسی ایک مشترک دکھ کے ناطے سے دوست نے دوست کو پہچان لیا تھا۔!!

سترھواں باب

سولہ سترہ برسوں پر محیط عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ غیر ممالک میں گذر چکا تھا۔ سولہ سترہ سال قبل کے دبلے پتلے مفلس و قلاش نوجوان کی جگہ اٹھتیس سالہ امیر کبیر اور پروقار فواد کو کسی نے بھی تو نہ پہچانا۔ یوں بھی وہ اس دور افتادہ علاقے کے عوام کے لئے ایک اجنبی تھا اور پھر اس نے کسی سے تعارف یا میل ملاپ کی ضرورت بھی تو محسوس نہ کی تھی۔

حویلی تو اب مکمل طور پر اس کے قبضے میں آچکی تھی لیکن اسکے خاندانی حالات اور کاروباری مصروفیات اس ویرانے میں اسے مستقل قیام کی اجازت نہ دیتی تھیں...

.... یہ اور بات ہے کہ اس کھنڈر نما، اجڑی پجڑی جگہ پر.... جہاں قدم قدم پر اس کی محبوب ترین ہستی کی یادیں بکھری پڑی تھیں وہ کسی دوسرے آدمی کا بھی وجود برداشت کرنے کو تیار تھا۔

اس علاقے کے قریب ترین شہر میں اس نے اپنی فرم کی برانچ کھولی۔ نئے آفس اور نئی جگہ پر مضبوطی سے قدم جمانے کے لئے وقت درکار تھا اور ان تھک محنت بھی۔ اور وہ اس کا عادی تھا۔!!

دن بھر کاروباری دھندوں میں الجھا ہوا وہ کہیں رات گئے فارغ ہوتا اور پھر کار لیکر دیارِ محبوب کی طرف چل دیتا۔ دشوار گذار پہاڑی راستوں پر رات کے وقت

ڈرائیونگ . . . اف توبہ ۔ ! صرف ایک غیر محتاط لمحہ اسے سینکڑوں ہزاروں فٹ نیچے گہرائی میں دھکیل سکتا تھا ۔ ! یہ لمبی مسافت طے کر کے حویلی تک پہنچتے پہنچتے رات کے ساڑھے دس، گیارہ بج جانا بھی اسکے لئے ایک عام سی بات تھی ۔

آج کل موسم خراب تھا ۔ برفباری کی وجہ سے سڑک بھی بند ہو چکی تھی اسلئے مجبوراً کار کافی دور چھوڑ کر باقی راستہ اسے پیدل طے کرنا پڑتا اور اس چکر میں بارہ بج جاتے ۔

موسم کی بلاخیزیوں کے باوجود وہ ناغہ کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا کہ آبادی سے دور . . . . اس خوفناک ویرانے میں . . . . . وہ پگلی النسانیہ اسکی منتظر رہتی تھی ۔

دکھی، پریشان حال اور ذہنی مریض النسانیہ . . . . . ! جو مغیرہ گل کی ماں تھی اور اس ناطے سے فواد کے لئے پوری پوری توجہ، ہمدردی اور احترام کی مستحق ۔ !!

ہمیشہ دوسروں کے لئے قربانیاں دینے کا عادی فواد اسے بھی اپنی حقیقی ماں کا درجہ دے چکا تھا اور ان حالات میں اسے نظر انداز کرنا یا اس سے لاپروائی برتنا اسکے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا ۔

حویلی میں آ کر سب سے پہلے النسانیہ کی جھونپڑی میں جانا، اسکے لباس، غذا اور علاج معالجے میں پوری پوری دلچسپی لینا اس کا سب سے پہلا کام تھا ۔ ایسا معمول جس میں ردوبدل یا ناغے کا کوئی امکان نہ تھا ۔

شہر سے وہ اس کے لئے عمدہ قسم کا گرم لباس، کھانے پینے کا سامان، فروٹ اور ضرورت کی دوسری اشیاء لاتا ۔ بہترین ڈاکٹرز کے مشورے سے اس کے لئے مہنگی مہنگی دوائیں ٹانک اور وٹامنز کی شیشیاں خریدتا اور پھر بڑے ہی خلوص اور احترام سکے ساتھ وہ النسانیہ کو یہ تمام چیزیں استعمال کراتا ۔ اپنی نگرانی میں ۔ ضد کر کے بڑے پیار کے ساتھ ۔ !!

فواد کی بے پناہ توجہ، دلچسپی، علاج اور مناسب دیکھ بھال نے انسانیہ کی ذہنی و جسمانی صحت پر بے حد خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ اس کی حالت روز بروز سنبھل رہی تھی۔ پاگل پن کے شدید دورے تو کب کے ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ آہستہ آہستہ اپنی اصلی حالت پر واپس آ رہی تھی۔ دماغ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

اکثر راتوں کو وہ اکٹھے گھومتے۔

حویلی کا کمرہ کمرہ۔

باغ کی روش روش۔

کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ۔!!

کبھی ٹارچ اور کبھی گیس کی روشنی میں طویل غلام گردشوں، راہداریوں اور حویلی کے پرپیچ راستوں پر وہ اس کی رہنمائی کرتی۔ اسے حویلی کی تاریخ اور اس کے ساتھ وابستہ داستانیں سناتی۔ مغیرہ گل کا کمرہ دکھاتی۔۔۔ اس کی پیدائش، بچپن اور جوانی کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت اور بھولی بھالی اداؤں کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بتاتی۔

اس کی منگنی، شادی اور موت کی تفصیلات کچھ اس انداز سے بیان کرتی کہ فواد کے سامنے اس کا مکمل نقشہ کھنچ جاتا۔ وہ خود کو اسوقت، ماحول اور فضا میں چلتے پھرتے محسوس کرتا اور انسانیہ کی ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔

انسانیہ کے استفسار پر وہ یونیورسٹی میں مغیرہ گل کے ساتھ تعارف سے لیکر آخری ملاقات تک کی زندگی اور اس کی مصروفیات کا حال لفظ بہ لفظ انسانیہ کے گوش گذار کر چکا تھا۔

اسے اپنے اور مغیرہ دونوں کے جذبات و احساسات کی جزئیات تک سے آگاہ کر چکا تھا۔

مغیرہ کا مزار فواد اور انسانیہ دونوں کے لئے مشترکہ دلچسپی کی جگہ تھی اور مغیرہ کے ناطے

سے فواد اور انسانیہ نے ایک دوسرے کو مکمل طور پر اپنا سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن چکے تھے۔

راز دار۔

غمگسار۔ اور دکھ سکھ کے ساتھی۔!!

گھومتے گھومتے رات زیادہ ہوجاتی یا سردی کی شدت میں اضافہ ہوجاتا تو فواد بڑے اصرار کے ساتھ انسانیہ کو اس کی جھونپڑی میں بستر پر لٹا کر آرام کی ہدایات دے کر چلا آتا۔

ایک ہمدرد اور مخلص ساتھی کی رفاقت میں جوں جوں انسانیہ کی ذہنی حالت بہتر ہوتی گئی۔ اس کی ضروریات بن کہے پوری ہونے لگیں۔ وہ آبادی میں جانے اور بھیک مانگنے کی ضرورت سے بے نیاز ہوتی گئی۔ اب تو وہ مہینوں آبادی کا رخ نہ کرتی تھی۔ ضرورت ہی نہ تھی۔!!

ہر رات حویلی میں خود بخود روشنیوں کے جلنے بجھنے، انسانوں کے چلنے پھرنے، ان کے قہقہوں اور گانے کی وجہ سے عجیب وغریب اور طلسماتی داستانیں اس علاقے میں زبان زد خواص وعام ہو چکی تھیں۔

انسانیہ کی اچھی صحت، عمدہ اور قیمتی لباس اور گڑھی کے لوگوں کے متعلق بے نیازانہ رویے سے علاقے کے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ بڑھیا اب مکمل طور پر جنوں اور بھوتوں کے قبضے میں آچکی ہے اور وہی جن بھوت جادو کے زور سے اس کے لئے لباس اور غذا کا انتظام کرتے ہیں اور انہی کی ہدایات کے مطابق وہ انسانی آبادی سے نہ صرف قطع تعلق کر چکی ہے بلکہ اتفاق سے اگر کہیں کسی کا سامنا ہو بھی جائے تو وہ قریب آکر بات کرنے کی بجائے پہلو بچا کر نکل جاتی ہے۔

گڑھی درا آدم خان کے لوگ خود انسانیہ سے خوفزدہ تھے۔ اگر اتفاق سے جنگل میں بھیڑ بکریاں

بجرا تنے دور سے کسی کی نظر اس پر پڑ جاتی تو وہ نہ صرف وہاں سے بھاگ نکلتا بلکہ کئی کئی روز تک اپنی مبالغہ آمیز داستانوں سے گڑھی والوں کو حویلی کے بارے میں طلسماتی کہانیوں کے متعلق مواد بھی فراہم کرتا رہتا۔

فواد اور انسانیہ ..... ان داستانوں کے مرکزی کردار، اول تو ان داستانوں سے بے خبر ہی رہتے اور بفرض محال کسی بات کی بھنک کان میں پڑ بھی جاتی تو وہ اسکی پرواہ کب کرتے تھے۔

وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ گرد و نواح کے لوگوں کے خیالات و نظریات سے بے نیاز اور قصّے کہانیوں سے بیگانہ —!!

اپنی ذات و افعال کے متعلق گڑھی کے توہم پرست لوگوں کی رائے جاننے یا اسے اہمیت دینے کی انہیں فرصت تھی نہ ہوش —!!

ان کی خود فراموشی اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کسی سے ملنے اور ان من گھڑت کہانیوں کی تردید کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔

انسانیہ کی داستان تمام ہوئی۔

کرسٹا اور ہیلن نے ماحول کا سحر ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔ انسانیہ اب چند گھنٹے پہلے والی پگلی بڑھیا نہیں بلکہ ایک اچھی خاصی نارمل عورت نظر آ رہی تھی۔

کرسٹا اور مقبرہ گل میں اتنی زبردست مشابہت دیکھ کر چند گھنٹے قبل عود کر آنے والے پاگل پن کا وقتی دورہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور اب وہ خاصی پر سکون دکھائی دے رہی تھی۔

ماضی کی المناک کہانی کو دہرانے کے بعد دل کا غبار نکل کر طبیعت اب کافی حد تک ہلکی ہو چکی تھی جبھی تو آخر میں اس نے دونوں لڑکیوں سے اپنے گذشتہ سخت رویے کیلئے معذرت پیش کرتے ہوئے، فواد کے لائے ہوئے سٹاک میں سے فروٹ، بسکٹ اور خشک میوہ نکال کر ان کی خاطر تواضع بھی کی تھی۔ ڈبل روٹی کے ساتھ پنیر اور ہنٹر بیف بھی انہیں پیش کیا تھا۔ سال ہا سال کے بعد ہوش میں آنے پر اس کی طرف سے مہمان نوازی کا یہ پہلا مظاہرہ تھا۔ اور پھر..... وہ لڑکیوں کو مغیرہ گل کی قبر پر لیکر گئی تھی۔ ساری حویلی میں گھمایا پھرایا تھا۔ اور باغ، کنج، آبشار، جھیل اور حویلی کی چار دیواری میں پھوٹتے والے ننھے منے چشموں کا نظارہ بھی کرایا تھا۔

"اف.....! کس قدر شاداب علاقہ ہے۔! پانی کی اتنی بہتات.....؟؟ جگہ جگہ چشمے، جھیل، جھرنے، آبشار اور ندیاں ــ!!"

دونوں لڑکیاں ایک ایک چیز گہرے انہماک اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

شام ہونے والی تھی ــ!!

واپسی پر انسانیہ کرسٹا اور ہیلن کو دور تک چھوڑنے آئی تھی۔ رخصت کے وقت اس نے بار بار کرسٹا کی پیشانی چومی تھی۔ اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔!! با اصرار اس کا پتہ پوچھا تھا۔ اور اسے دوبارہ یہاں آنے کی تاکید کی تھی۔ !!

اور کرسٹا..... اس نے انسانیہ کے تمام سوالات کے جوابات بڑے گول مول، مبہم غلط اور نامکمل سے دیئے تھے۔ اپنی بعض مجبوریوں اور جلد واپسی کے پیش نظر دوبارہ نہ آسکنے کے لئے معذرت بھی پیش کر دی تھی..... تاہم اس نے انسانیہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی موقع ملا تو وہ دوبارہ اس سے ضرور ملے گی۔

ریسٹ ہاؤس پہنچتے پہنچتے تاریکی مکمل طور پر پھیل چکی تھی۔!!

کھانا تیار تھا اور تھکی ہاری لڑکیاں جلد لیٹنے کے موڈ میں تھیں اس لئے ہیلن کے کہنے پر چوکیدار نے کھانا میز پر لگا دیا۔

کرسٹا نے ہیلن کا ساتھ دیا۔ مگر بڑی بے دلی کے ساتھ۔!!

چند نوالے اٹھا کر اس نے برتن ہٹا دیئے اور ہیلن کے اصرار پر معذرت کرتی ہوئی میز پر سے اُٹھ گئی۔

انسانیہ کی داستان سننے اور اس سے رخصت ہونے کے بعد سے اب تک وہ گم سم سی تھی۔ عام دنوں سے بہت مختلف۔ چپ چاپ اور کچھ سوچتی ہوئی۔!!

کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھی منہ سے خود بخود نکل جاتی اور آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں حلق میں پھندے سے پڑنے لگتے۔

لیٹنے سے پہلے اس نے اپنے بیگ سے ایک پرانی سی ڈائری نکالی۔۔۔۔ مغیرہ گل کی ڈائری۔ جسے انسانیہ کی محبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے مغیرہ کے سامان سے انسانیہ کی آنکھ بچا کر بڑی ہوشیاری سے اڑا لیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ مہذب سوسائٹی کے آداب کے خلاف۔!

لیکن اخلاق و تہذیب کے رسمی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اس نے وہ ڈائری اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ یہ سوچ کر کہ شائد اس بھولی بسری داستان کے بکھرے ہوئے ٹکڑے مجتمع کر کے ایک مکمل تصویر بنائی جا سکے۔ ایک ایسی تصویر۔۔۔۔ جو اس کے ماضی و حال کے درمیان حائل ایک ہولناک خلا کو پر کر سکے۔ اس خلا کو۔۔ ۔۔۔ جس نے اس کی "عظیم ماں" کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ عین عالم شباب میں

. . . . اس کی پیشانی پر ایک داغ لگا تھا۔ طلاق یافتہ۔!! اور وہ . . . . . وہ خود بھی تو ہمیشہ باپ کی شفقت اور محبت کے سائے سے محروم رہی تھی۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی ایک یتیم بچی کیطرح زندگی گذاری تھی۔ زندگی کی بہت سی خوشیوں اور نعمتوں سے محروم رہ کر۔ !!

وہ اپنے باپ، اپنے گھر اور اپنے کنبے کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔ تفصیل کیساتھ۔!! انسانیہ کی داستان نے دل کے سارے زخموں کو کرید ڈالا تھا۔ تشنگی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ !!

کرسٹا نے ڈائری کھولی۔

ایک لفافہ ڈائری سے پھسل کر اسکی گود میں آگرا . . . . اور اس کے ساتھ ہی بہت سی تصویریں بھی۔ !!

کرسٹا نے پہلی تصویر اٹھائی، دوسری اور تیسری بھی۔ !!

پہلی تصویر میں مغیرہ اکیلی تھی۔ دوسری میں فواد یونیورسٹی میں ٹیبل ٹینس کھیل رہا تھا اور تیسری تصویر دونوں کی تھی۔ اکٹھے۔!! اسی قسم کی اور بھی بہت سی یادگار تصاویر تھیں۔ لفافے کے اندر ایک اور چھوٹا سا لفافہ بھی تھا۔ تصویروں سے بھرا ہوا۔!! وہ نکالتی گئی۔

اوہ . . . . یہ تو کرسٹا کی ماں اور اسکے باپ کی تصاویر تھیں اور اس کے اپنے بچپن کی بھی . . . !! اس وقت کی جب وہ بالکل ایک منی سی گڑیا ہوا کرتی تھی۔ بالکل چھوٹی سی۔ گول مٹول پلاسٹک کی رنگین اور جیتی جاگتی گڑیا۔ !!

کرسٹا کے مختصر سے کنبے کی یہ تصویریں مغیرہ نے اپنے باپ سے لی تھیں۔ اپنے

البم میں لگانے کے لئے - اکثر تصویروں کے پیچھے کیپشن لکھے ہوئے تھے - اسکے باپ کی اپنی تحریریں .... وہ تحریر جس کے چند نمونے وہ "ممی" کے پاس دیکھ چکی تھی - خط جنہیں ممی پڑھا کرتی تھیں - کرسٹا سے چھپ چھپا کر -!! اپنی تنہائیوں کو بہلانے کے لئے وہ گذرے ہوئے زمانے کی سہانی اور خوشگوار یادوں میں پناہ ڈھونڈ لیا کرتی تھیں -

"اف ..... کتنی عظیم ہیں ممی - عام عورتوں سے کس قدر مختلف - ان کے بالکل برعکس"!!

وہ یکے بعد دیگرے اپنے ماں باپ کی تصویریں دیکھتی رہی "کتنا خوبصورت جوڑا تھا -!!

آنسو گرتے رہے - ٹپ - ٹپ - ٹپ -!!!

باپ کا ہیولا اس کے سامنے مجسم ہو کر رہ گیا تھا - مردانہ حسن کا مجسمہ -!

وقار - تمکنت اور چہرے پر پیدائشی بڑا پن -!!

ہیلن نے جانے کب کافی کا کپ لاکر قریب ہی میز پر رکھ دیا تھا -

مگر ... وہ ڈائری کے مطالعے میں مگن تھی -

Again you are in the world Of your dream ?

اپنے سوال کا جواب نہ پاکر ہیلن کروٹ بدل کر سو گئی - کافی کا کپ وہیں پڑے پڑے ٹھنڈا ہو چکا تھا -

رات کے پچھلے پہر انسانیہ کی داستان اور مغیرہ کی ڈائری کی روشنی میں اسکے ذہن میں ہمیشہ سے موجود تصویر کا دھندلا سا خاکہ مکمل ہو چکا تھا - اس نے ڈائری اور تصویریں تکیئے کے نیچے رکھ کر آنکھیں موند لیں -

آنسو بہتے رہے - تکیہ بھیگتا رہا ..... اور اسی عالم میں صبح ہو گئی -

اٹھارواں باب

"فواد.....!"
مغیرہ گل کی تربت پر دیپ سجاتے سجاتے ایک ہلکی سی مترنم نسوانی آواز سن کر وہ اپنی جگہ سے تقریباً اچھل پڑا۔
گھوم کر دیکھا... کچھ بھی نہ تھا..... کچھ بھی تو نہیں۔!!
گذشتہ دو تین روز سے انسانیہ پر نمونیے کا شدید حملہ ہوا تھا..... شائد بے پناہ سردی میں گھومنے پھرنے یا پھر بڑھاپے میں کمزوری کے باعث۔! بہر حال آج تو اس کی طبیعت بہت خراب تھی۔
بیماری اور تکلیف کے باعث کئی روز سے وہ فواد کے ساتھ حویلی کی طرف بھی نہ آئی تھی۔ اور فواد..... وہ شہر سے آتے ہی حسب معمول سب سے پہلے اسے دیکھنے جھونپڑی میں جاتا، اسے دوائیں کھلاتا پلاتا۔ اس کی غذا کا خیال کرتا اور پھر مکمل آرام کی ہدایات کے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء وہاں چھوڑ کر، اسے اچھی طرح لحاف اور کمبل وغیرہ اوڑھا کر واپس چلا آتا۔
مغیرہ گل کی قبر پر دیئے جلانا، پھول چڑھانا اور پھر..... وہاں بیٹھ کر گھنٹوں اس سے باتیں کرنا اور ماضی کو دہرانا فواد کا معمول سا بن چکا تھا۔ بعض اوقات موڈ میں آکر بیٹری سے چلنے والا ٹیپ ریکارڈر آن کر کے وہ برسوں پہلے یونیورسٹی کی پارٹیز اور

فنکشنز میں مغیرہ گل کے گائے ہوئے گانے سنتا۔ اس کی سوز بھری سریلی آواز کے سحر سے لطف اندوز ہوتا اور۔ ۔ ۔ ۔ حال کو بھول کر ماضی کے ان حسین اور رومان پرور لمحات کی یاد میں کھو جاتا جو اسکے لئے حاصل زندگی تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی تنہا زندگی کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!!

یہ ایک حساس انسان اور شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والے انٹلیکچوئل کے تخیل کی کرشمہ سازی ہی تو تھی کہ اس سے وہ مغیرہ گل کو اپنے بالکل قریب محسوس کرتا۔ دل کی دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب۔ ۔ ۔ ۔!! اپنے آس پاس چلتے پھرتے، ہنستے بولتے اور روح افزا موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔! اور تب ہوا کی سرسراہٹ کو بھی اسکے قدموں کی آہٹ سمجھ کر وہ چونک چونک اٹھتا۔ ۔ ۔ ۔ مہکی ہوئی ہواؤں میں اس کے سانس کی خوشبو محسوس کرتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی سرگوشیاں سنتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیار بھرا لہجہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور روح میں زندگی کی حرارت بیدار کر دینے والی خوبصورت باتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

کانوں میں شہد ٹپکاتی ہوئی مترنم آواز۔

روح پرور مسکراہٹ اور دلکش و دلفریب ادائیں۔!!

اس قسم کے عالم بیخودی و مدہوشی میں تخیل و تصور کی تمام باتیں اس کے لئے حقیقت بن جاتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکستہ اور دکھی دل کو بہلانے کا ایک خوبصورت بہانہ۔!!

وہ جاگتے میں خواب دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ زندگی میں اسکے علاوہ رہ بھی کیا گیا تھا!

"فواد۔!"

پیار بھرا لہجہ بڑا واضح تھا۔ آواز اب کے دوسری سمت سے آئی تھی۔ اس نے گردن موڑی۔

"کچھ نہیں ..... کچھ بھی تو نہیں ..... وہم صرف وہم۔!"
ہوا کے سرکش جھونکوں سے ٹمٹماتے ہوئے دیپ کو بچانے کے لئے اس نے ہاتھ کا ہالہ سا بنایا اور پھر ایک دیپ کی لو سے دوسرے دیپ کو روشن کرنے لگا۔
چند منٹ اور گذر گئے۔
سریلی اور مترنم ہنسی..... وہی آواز..... وہی انداز جو برسوں پہلے فواد کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گرا تھا۔ اب کی مرتبہ آواز بے حد واضح اور نمایاں تھی۔ فواد کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں کہ یہ آواز زندگی سے اس قدر زیادہ بھرپور تھی کہ وہ اسے وہم یا تخیل کی کرشمہ سازی تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا۔
ایک عالم گھبراہٹ میں اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور پھر ہاتھ میں روشن دیپ اٹھائے وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا.....
"آواز یہیں سے آئی تھی شائد"
چراغ کی دھندلی اور ناکافی روشنی میں اس نے ہر طرف ڈھونڈا اور مایوس ہو کر لوٹ آیا۔
"یہ صرف میرے حد سے بڑھے ہوئے جنوں کی کرشمہ سازی ہے ورنہ..... اس ویرانے میں آدھی رات کے وقت کون آسکتا ہے۔"
اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش میں اپنی حالت پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ ایک طنزیہ ہنسی۔!!
دیئے کو مزار کے سرہانے رکھ کر وہ تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو گیا۔ مغیرہ گل کی روح کو سکون پہنچانے کا یہی ایک طریقہ اس کو معلوم تھا۔

گرم پانی کی بوتل النسانیہ کے بستر میں رکھنے اور اسے دوا پلا کر اچھی طرح لحاف اوڑھانے کے بعد فواد نے اور لکڑیاں آتشدان میں ڈال دیں تاکہ اس کی جھونپڑی کا ٹمپریچر زیادہ گر کر النسانیہ کے لئے تکلیف دہ ثابت نہ ہو کہ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق مریضہ کو سردی سے محفوظ رکھنا بے حد ضروری تھا۔

اسے دی جانے والی دوا میں خواب آور دوائی بھی شامل تھی۔ تھوڑی دیر بعد النسانیہ گہری نیند سو چکی تھی۔ اس خاموش فضا میں اس کے خراٹوں کی آواز سے ایک ارتعاش سا پیدا ہو رہا تھا۔

اپنا اطمینان کر لینے کے بعد فواد اٹھا اور حویلی کی مین بلڈنگ کی طرف سے ہوتا ہوا مغیرہ گل کے مزار کیطرف نکل آیا۔

"اوہ . . . !" وہ ٹھٹھک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ برآمدے کے ستون کا سہارا لے کر۔

چاند کی مدہم روشنی میں ایک سفید سایہ مغیرہ کے مزار کیطرف سے گھنے درختوں کے جھنڈ کیطرف جا رہا تھا۔

فواد نے آنکھیں مل مل کر بغور دیکھا۔ شک و شبے کی گنجائش ہی نہ تھی۔! یخ بستہ رات کا ہولناک سناٹا . . . . گھنا جنگل . . . . تباہ و برباد حویلی کی عمارت . . . مغیرہ گل کا مزار اور وہ . . . . وہ سفید سایہ . . . . !!

ذہن پر ہزار زور ڈالنے پر بھی فواد کی عقل بیکار ثابت ہو رہی تھی۔ انتہائی ذہنی انتشار کے عالم میں وہ اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"وہم ۔ ۔ ۔ ۔؟ نہیں ۔ ! حقیقت ۔ !!

"حقیقت ۔ ۔ ۔ ۔؟ نہیں ۔ ! وہم ۔ ! نظر کا دھوکا ۔ !!"

منتشر خیالات کے ہجوم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس نے بیٹری سے چلنے والا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا ۔

برسوں پہلے یونیورسٹی کی پکنک پارٹی پر سنایا ہوا مغیرہ گل کا گیت ۔ جادو بھرے بول ۔! ماحول کا سحر ۔!

مغیرہ گل کی آواز ۔ دل کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی ۔ مدھ بھری اور سریلی ۔ !!

اس جادو بھری خاموشی میں خوابیدہ مناظر فطرت انگڑائی لیکر بیدار ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے ۔ فواد کی روح تک جھوم اٹھی ۔

ہر بار گیت ختم ہونے پر وہ ٹیپ کو نئے سرے سے چلا دیتا اور اسی چکر میں رات دبے پاؤں گذرتی چلی گئی ۔

آج فواد کی طبیعت قدرے خراب تھی ۔ زکام اور کھانسی کے ساتھ ہلکا سا ٹمپریچر بھی تھا ۔ اوپر سے سردی کی شدت ۔ !!

کانپتا اور ٹھٹھرتا ہوا انسانیہ کو دیکھ کر وہ حویلی میں آیا اور مغیرہ کے مزار کا سہارا لے کر چپ چاپ بیٹھ گیا ۔

ناسازیٔ طبع ۔ اداسی اور بوریت ۔ !!

اور کوٹ کے اوپر اس نے کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا اور . . . پھر حسب معمول وہ یاد ماضی میں کھو گیا . . . یاد ماضی . . . جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا تھا۔

ے یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

"کاش ان ڈس لینے والی یادوں سے نجات حاصل کرنا میرے بس میں ہوتا۔" اس نے دکھی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔

اس عالم میں چند لمحے اور چپکے سے رینگ گئے۔

اچانک وہ اچھل پڑا۔ ایک نسوانی، مترنم اور سریلی آواز اسے عالم خود فراموشی سے حقیقت کی اس دنیا میں کھینچ لائی تھی۔

گیت وہی تھا . . . مغیرہ گل کا گایا ہوا۔ یونیورسٹی کی پکنک پارٹی پر۔

وہی آواز۔

وہی دھن۔!

آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

"میں نے ٹیپ ریکارڈر تو نہیں لگایا۔!" وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرف لپکا۔

ٹیپ ریکارڈر بند تھا۔

"مگر یہ آواز . . . ؟؟" وہ پریشان سا ہو گیا "مغیرہ گل کے ساتھ جنوں کی حد تک پہنچی ہوئی محبت کی بدولت تخیل حقیقت کا روپ دھار رہا ہے جس کی آخری منزل پاگل پن ہی ہو سکتی ہے۔ مکمل پاگل پن۔!"

اسے اپنی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا اور تب چند دنوں بعد گلیوں اور سڑکوں پر

"پاگل پاگل" کے نعروں کے درمیان پتھر برساتے ہوئے بچوں کے ہجوم کے تصور ہی سے اسے جھرجھری سی آگئی۔ سر جھٹک کر اس نے اپنے ذہن سے اس ہولناک خیال کو نکالنا چاہا مگر آواز ...... !وہ تو مسلسل آرہی تھی۔

"تو .... تو کیا یہ تخیل نہیں۔؟ ناقابلِ یقین سچائی۔ ؟؟ اوہ .... معبود ...!!"

اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

آواز آتی رہی .... گیت جاری رہا .... بڑی دیر تک۔!

اگلے دن اپنے آفس میں اس کا ذہن تمام دن اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش میں الجھا رہا مگر جوں جوں وہ غور کرتا گیا گتھی الجھتی گئی۔

بے چینی۔ کشمکش۔

اضطراب۔ ذہنی ہیجان۔

تجسس اور حیرت۔!!

سارا دن اس کا جسم تیز بخار میں پھنکا گیا .... اور اگلی رات جب اس نے حویلی کی طویل اور تاریک راہداری میں پھر اسی سائے کو دیکھا تو وہ چلا اٹھا۔

"ٹھہرو۔!" ہاتھ میں ٹارچ لئے وہ اسکے پیچھے بھاگا۔

سایہ حویلی کی بھول بھلیوں میں گم ہوچکا تھا۔ ٹارچ روشن کئے وہ ایک ایک کمرے، برآمدے اور راہداری میں اسے تلاش کرتا رہا مگر بے سود۔!

ذہنی انتشار اور جسمانی تکلیف نے اسے بہت جلد تھکا ڈالا اور جب سائے کی تلاش

بس ناکام ہو کر تھکے تھکے، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا وہ واپس مزار کیطرف آرہا تھا تو اس نے پھر ایک بار.... اسی نسوانی آواز میں گیت کے وہی مترنم بول سنے۔ بے حد واضح اور صاف صاف۔!!

"اف... فوہ....! میرے خدا.....! یہ سب کیا ہے۔؟؟؟"

سردی کی ایک تیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتی ہوئی نکل گئی اور برف آلود ہواؤں کے باوجود پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا اٹھے۔ اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے وہ آواز کی سمت دوڑ پڑا۔

روشن چاندنی میں وہی سایہ مزار پہ جھکا ہوا گنگنا رہا تھا۔ فواد کے قدم زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے۔ مضبوط اعصاب کا ایک جفاکش مرد ہوتے ہوئے بھی خوف کی ایک انجانی لہر نے اسکے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی عالم خوف وحیرت میں کتنے ہی منٹ چپکے سے رینگ گئے۔

لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بڑی ہمت کر کے وہ سائے کیطرف بڑھا....

مگر وہ تو غائب ہو چکا تھا۔

باڑ کے پیچھے۔

گھنے درختوں میں۔ جھرنے کے پاس۔ ادھر ادھر اس نے ہر جگہ ڈھونڈا....

پر وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔

"عورت تھی یا چھلاوہ۔؟؟؟"

اس کا ذہن سن ہو کر رہ گیا۔

وہ کھڑا تھا۔ اپنی جگہ پہ۔ ٹارچ کی روشنی ہر طرف ڈال ڈال کر اسے تلاش کر رہا تھا

مگر سب بیکار۔!!

ایک طویل ٹھنڈا سانس لے کر وہ مزار کی طرف چل دیا لیکن ... یہ کیا..... ؟؟

مغیرہ گل کے مزار پر بکھرے ہوئے پھول..... ؟

تازہ اور رنگا رنگ کے پھولوں کی باس فضا میں رچی بسی تھی۔ سارے میں پھیلی ہوئی تھی..... اور مزار پر رکھے ہوئے سبھی دیپ جل رہے تھے۔ قطار اندر قطار۔!!

آدھی رات کا عالم۔ ہر طرف سناٹا اور پراسراری خاموشی۔ آبادی سے دور.....

اس خرابے میں کسی نوجوان عورت کا وجود۔! قبر پر تازہ پھولوں کا ڈھیر اور وہاں پڑے ہوئے چراغوں کا خود بخود جلنا۔! ایک معمہ ہی تو تھا۔ لاینحل مسئلہ۔!!

فواد کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ جوں جوں وہ غور کرتا زیادہ سے زیادہ الجھتا چلا جاتا۔!!

"حویلی آسیب زدہ ہے۔"

"حویلی پر جنوں اور بھوتوں کا قبضہ ہے۔"

"روحیں یہاں آزادانہ چلتی پھرتی اور گاتی بجاتی ہیں۔"

آس پاس کی آبادیوں میں حویلی کے بارے میں پھیلی ہوئی طلسماتی کہانیاں اسے حقیقت معلوم ہونے لگیں اور تب..... بچپن میں پڑھی یا سنی ہوئی روحوں، جنوں، بھوتوں اور پریوں کی تمام داستانیں اس اعلیٰ تعلیمیافتہ اور روشن خیال شخص کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئیں۔

وہ سوچتا رہا..... مافوق الفطرت باتیں..... ناقابل یقین افسانے آج حقیقت بن کر سامنے آرہے تھے.....!

دنیا بھر کا ادب اس قسم کے حیرت انگیز واقعات وحادثات اور قصے کہانیوں سے

پٹا پڑا تھا اور فواد کو جو عجیب و غریب واقعات و حالات پیش آ رہے تھے وہ اس بات کا واضح ثبوت تھے کہ ان داستانوں میں حقائق کا عنصر بہر حال موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ کرۂ ارض کے دور دراز اور مختلف گوشوں میں رہنے والے بے شمار ادیب اور شاعر ایک ہی رنگ اور ایک ہی انداز میں سوچتے۔

چند لمحوں کے بعد اسی سائے کی جھلک ایک مرتبہ پھر اسے نظر آئی۔ وہ تیزی سے گذر گیا تھا۔

خوف اور سردی کی ایک دھند نے فواد کی ساری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آج جمعرات تھی۔

مغیرہ گل کے مزار پر ترتیب سے رکھے ہوئے نئے چراغوں میں تیل اور بتیاں ڈال کر فواد انہیں روشن کرتا جا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی پیدائشی پجاری کی طرح ۔ ۔ ۔ مگن تھا اپنے کام میں ۔ ۔ ۔ ۔ !!

ایک مترنم گنگناہٹ۔

قریب ۔ ۔ ۔ ۔ کہیں بہت ہی قریب ۔ ۔ ۔ ۔ !!

وہ چونک اٹھا۔ مڑ کر دیکھا۔ وہ کھڑی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ۔ ۔ ۔ ۔ !!

سفید مرمریں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سنہری تھال میں روشن موم بتیوں کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں اس کا دمکتا ہوا چہرہ یوں دکھائی پڑتا تھا جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند — !!

"مغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ !!" روشنی کے ہالے میں اس کے حسین چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ

بے ساختہ چلایا۔ "مغیرہ۔۔۔ مغیرہ۔۔۔!" ایک عالم بدحواسی میں اپنے دونوں بازو پھیلا کر وہ اس کی طرف بھاگا۔

وہ گھبرا کر تیزی سے پیچھے ہٹی۔ جھٹکے سے تھال گرا اور تمام موم بتیاں زمین پر گر کر گل ہو گئیں۔

سب کچھ وہیں زمین پر چھوڑ چھاڑ کر وہ بھاگ نکلی تھی۔

"مغیرہ۔۔۔۔! مغیرہ۔!" وہ کسی بیقرار روح کی طرح چلایا۔ "ٹھہرو۔! خدا کیلئے۔!" وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔۔۔ ہانپتا کانپتا ہوا۔ اور مغیرہ گل۔۔۔ ۔۔۔ وہ تو گم ہو چکی تھی۔۔۔۔ وہیں کہیں۔۔۔۔ حویلی کے طویل اور تاریک کمروں یا شائد راہداریوں میں۔۔۔۔!!

کافی دیر کی تلاش میں ناکام رہنے کے بعد وہ واپس چلا آیا۔۔۔۔ تھکے تھکے سے قدموں اور مری مری چال کے ساتھ۔!!

نقطۂ انجماد سے بھی نیچے ٹمپریچر اور شدید سردی کے باوجود اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ رنگ زرد تھا اور چہرہ مرجھایا ہوا۔۔۔۔ مانو جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو۔ یہ خوف تھا یا تھکن۔۔۔۔ کون جانے۔!!

نڈھال ہو کر وہ مغیرہ کی قبر پہ ڈھیر ہو گیا اور آنکھیں۔۔۔ وہ تو خود بخود مند گئی تھیں۔

اس کے سوچنے اور سمجھنے کی تمام قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔۔۔۔ دل و دماغ اور جسم و روح سبھی بیکار ہو چکے تھے۔

ذہنی و جسمانی تکلیف اور غم و اندوہ سے کچلے ہوئے اعصاب نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا اور۔۔۔ اب وہ قبر کے کتبے کے ساتھ سر ٹکائے گٹھڑی

سا بنا پڑا تھا۔ کسی مجبور و لاچار اور بے سہارا انسان کی طرح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

"اوہ ۔ ۔ ۔ آہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اف ۔ ۔ ۔ ۔ !!"

ایک غنودگی کے سے عالم میں وہ کراہ رہا تھا۔

انیسواں باب

" ماہر روحانیات، عملیات، دست شناسی و علم جفر و نجوم پروفیسر صدیق علی خان ـــ !"

مین روڈ پر ایک بڑا سا بورڈ لٹکتا ہوا دیکھ کر فواد نے کار روک لی ۔ آج اخبار میں پروفیسر صدیق علی خان کا انٹرویو اور اس میدان میں اس کی بے پناہ صلاحیتوں کی تفصیلات پڑھ کر اپنی الجھن کا حل تلاش کرنے کے لئے وہ پروفیسر صدیق کی طرف آنکلا تھا۔

گذشتہ چند راتوں سے حویلی میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات نے اس کا آرام و سکون چھین کر اسے سخت قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ وہمی یا توہم پرست تو کبھی نہ تھا۔ ضعیف الاعتقادی بھی اسے چھو کر نہ گذری تھی لیکن . . . . . اپنی آنکھوں سے اتنا کچھ دیکھ کر اسے نظر انداز کر دینا بھی تو ممکن نہ تھا۔ ! اور پھر رات کا واقعہ . . . . . . !!

پہروں سوچنے، غور کرنے اور اس موضوع پر کئی اردو، انگریزی کتب اور دوسری زبانوں کے تراجم کا مطالعہ کرنے پر بھی اس کا الجھا ہوا ذہن یہ معمہ حل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ان سارے معاملات کو وہم سمجھ کر فراموش کر دینے کی کوشش بھی خود فریبی سے کم نظر نہ آتی تھی۔ " ڈوبتا آدمی تنکوں کے سہارے تلاش کرتا ہے "۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر آج وہ پروفیسر صدیق علی خان کے بالا خانے پر آنکلا تھا۔ " مشورہ کر لینے میں حرج ہی

کیا ہے۔ شائد دل کا اضطراب اور بے چینی دور کرنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔!
سیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک طرف پڑا ہوا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ علم جفر و نجوم، رمل اور پامسٹری سے متعلق نقشے، جنوں، بھوتوں کی فرضی تصویریں رنگا رنگ کی اشکال اور اجرام فلکی کے خاکے آویزاں تھے۔ کئی چھوٹی بڑی مورتیاں اور انسانی کھوپڑیاں بھی سامنے مینٹل پیس اور الماریوں میں رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف لگے ہوئے بڑے سے چارٹ پر چاند، زہرہ، مشتری، عطارد، مریخ، شمس اور جانے کس کس الابلا کے ساتھ انسانی ہاتھ کے پرنٹ بھی بنے ہوئے تھے۔
مذکورہ بالا موضوعات پر مشتمل پروفیسر صدیق علی خان کی تین چار کتابیں بھی مارکیٹ میں آچکی تھیں اور ان سب کی ایک ایک جلد پروفیسر کے مطالعے کی میز پر کچھ اس انداز سے نمایاں کر کے رکھی گئی تھی کہ ہر آنے جانے والے کی پہلی نگاہ انہی پر پڑے۔
علم روحانیات، عملیات، جفر و نجوم اور پامسٹری کے متعلق دنیا کے مشہور مصنفین کی نادر و نایاب اردو، انگریزی اور سنسکرت کی قدیم و جدید کتب کا ایک معقول ذخیرہ سامنے والی الماری اور شیلف میں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ پروفیسر نے اس میدان میں واقعی سچی لگن اور محنت سے کام کیا ہے۔ اس کی تصنیف کردہ کتابیں اس کی عمر بھر کی محنت، ریاضت اور ریسرچ کا نچوڑ تھیں۔
پروفیسر صدیق علی خان بظاہر "خان" کم اور کوئی ہندو پروہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ سرخ سرخ آنکھیں، لحیم شحیم، کالا دھت، سر پر کھچڑی سے بالوں کا چھوٹا سا گچھا جو ایک جوڑے کی شکل میں پنوں کے ساتھ بندھا پیچھے گردن پر پڑا ہوا تھا۔ پروفیسر ایک بڑی سی میز کے ساتھ گھومنے والی کرسی پر بیٹھا اپنے کام میں کچھ اس قدر منہمک

تھا کہ اسے فواد کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی۔

فواد نے دیکھا۔

میز پر کسی کے ہاتھ کا پرنٹ پڑا ہوا تھا اور پروفیسر ایک محدب شیشے کی مدد سے لکیروں کا مطالعہ کر رہا تھا۔

فواد نے پروفیسر کے سراپا پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر اسکی نظریں پروفیسر کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

نقوش کچھ جانے پہچانے سے تھے۔

"تم اسے جانتے ہو۔ بڑی اچھی طرح۔" فواد کے دل نے سرگوشی کی۔

دماغ پر زور ڈالا تو ذہن کے پردے پر دھندلے سے نقوش واضح ہونے لگے۔ سکول کے زمانے کا ایک تیز طرار اور دبلا پتلا نوخیز لڑکا اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

صدیق۔؟ ماسٹر نور احمد کا بیٹا۔! جو لڑکپن میں ہی جادو، جفر و نجوم اور ہپناٹزم جیسے موضوعات پر مشتمل چھوٹی بڑی کتابوں کے مطالعے میں کھویا رہتا تھا۔ عامل و معمول کے چکروں میں دن کا بیشتر حصہ گذارتا تھا۔

کھیل کود کے اوقات یا فری پیریڈز میں بھی وہ باقی کلاس فیلوز سے الگ تھلگ پتہ نہیں کہاں کہاں سے لائی ہوئی کتابوں کے بوسیدہ اوراق میں گم نظر آتا۔ اپنے دوستوں اور کلاس فیلوز کے ہاتھ دیکھتا اور ماضی و حال کے متعلق انہیں عجیب عجیب باتیں بتاتا اور کبھی کبھی مستقبل کی بھی پیشگوئیاں کیا کرتا تھا۔

کچھ اتفاق تھا یا اس کے وسیع مطالعے کا کرشمہ کہ اسکی بتائی ہوئی چند باتیں بالکل صحیح نکل آئیں۔ بس پھر کیا تھا۔۔۔۔ لڑکوں پر اسکی علمیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کی دھاک

بیٹھ گئی۔ اب وہ پنا بنایا نجومی تھا۔

اس کے بعد وہ اکثر لڑکوں کے ہجوم میں گھرا ہوا نظر آتا۔ لڑکوں کے گروہ کے گروہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کے لئے نظر آتے۔ اور ان کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر بعض اوقات وہ ان کی جیبوں سے ساری کی ساری پاکٹ منی بھی نکلوا لیا کرتا تھا جسے.... لڑکے محسوس تک نہ کرتے تھے۔

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے وہ سکول بھر میں صدیق نجومی کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔

"صدیق ـــ!!"

فواد کے لہجے کی بے تکلفی دیکھ کر صدیق نے اسے بغور دیکھا۔ سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر۔ فواد کو پہچاننے میں اسے صرف چند لمحے لگے اور پھر دونوں بچپن کے ساتھی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ چند رسمی باتوں کے بعد چائے کی چسکیوں کے درمیان فواد اسے اپنی پوری کہانی اور گذشتہ چند روز سے پیش آنیوالے پراسرار واقعات کی تفصیلات سنا رہا تھا۔ ثبوت کے طور پر اس نے مغیرہ کے ہاتھ سے گرنے والا تھال اور موم بتیاں بھی پروفیسر کو دکھائی تھیں۔!!

"ہوں.....!" پروفیسر نے اس کی داستان کا ایک ایک لفظ گہری توجہ سے سنا تھا۔ بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ۔!!

"ماہرین علم روحانیات کی ریسرچ کے مطابق ایک سچے اور پاکباز عاشق کے لئے اپنے محبوب کی روح سے رابطہ قائم کر لینا ممکن ہے۔ دراصل تمہارے خلوص، وفا اور جنوں کی حد تک بڑھی ہوئی محبت نے مغیرہ گل کو تھوڑی دیر کیلئے عالم ارواح سے اس دنیائے آب و گل میں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن اب تمہیں بڑے صبر و سکون

کے ساتھ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا ورنہ تمہاری ذرا سی بے احتیاطی سارے معاملے کو پلک جھپکنے کی دیر میں بگاڑ سکتی ہے۔"

پروفیسر نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں اظہار خیال کیا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں دوست ..... مگر ہاں .... ذرا سنبھل کر... ورنہ عمر بھر پچھتاؤ گے۔!!"

فواد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے اسے بڑے دوستانہ انداز میں نصیحت کی اور اپنی بات کی تائید میں بڑے بڑے ناموں سے موسوم کتابیں کھول کھول کر انکے اقتباسات فواد کو سنانے لگا۔

ساری کتابیں ناقابل یقین اور محیر العقول واقعات سے بھری پڑی تھیں۔ کہیں تجربات تھے، کہیں مشاہدات اور کہیں محض سنی سنائی باتیں۔!!

فواد کو ایمان لاتے ہی بنی۔

بلاشبہ پروفیسر صدیق علی خان اپنی چرب زبانی سے ایک اچھے بھلے تعلیمیافتہ شخص کے ذہن کو بھی اپنی گرفت میں لانے کی مکمل صلاحیت رکھتا تھا۔

بیسواں باب

چند دنوں کے بعد پہاڑوں پر برفباری تھم چکی تھی۔ جاڑے کا زور ٹوٹ چکا تھا اور موسم میں ایک خوشگوار سی تبدیلی آگئی تھی۔

مغیرہ گل کے سائے کو فواد نے اس کے بعد بھی بارہا دیکھا تھا.... مگر کافی فاصلے سے۔!

پروفیسر صدیق علی خان سے ملاقات کے بعد فواد کا خوف اور پریشانی بالکل دور ہو چکی تھی۔ اکثر وہ پروفیسر سے مشورہ لیا کرتا تھا بلکہ ایک دو مرتبہ تو پروفیسر اس کے ساتھ حویلی میں سائے سے ملاقات کے لئے آیا بھی تھا..... شائد کوئی نیا تجربہ یا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا لیکن .... ساری ساری رات انتظار کے باوجود بھی اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔ فواد اور پروفیسر دونوں کا خیال تھا کہ شائد مغیرہ گل کی روح کو پروفیسر سے ملاقات گوارا نہیں۔ لہٰذا اب وہ صرف فواد کو مشورے دینے پر ہی اکتفا کرنے لگا تھا۔

فواد کے دل میں کسی بے چینی اور اضطراب کی جگہ اب دلچسپی اور عقیدت و محبت کے جذبات نے لے لی تھی۔ وہ سائے کا انتظار کرتا۔ باغ میں ٹہل ٹہل کر۔ برآمدوں اور کمروں میں گھوم گھوم کر۔ !!

اس کی ایک جھلک، ایک مسکراہٹ اور ایک ادا دیکھنے کے لئے وہ پوری پوری رات اسی عالم میں گذار دیا کرتا تھا۔

نکلتی سردیوں کی اس خوبصورت، تاروں بھری اور رومینٹک رات میں آج....

وہ پھر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی اور ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سچ مچ آگئی۔

"فواد ۔۔ !"

شعر و نغمہ سے معمور سریلی آواز سن کر اس کا دل زور سے دھڑکا۔ آج بڑے دنوں کے بعد پھر اس نے نام لیکر فواد کو پکارا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کھڑی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ۔ ۔ ۔ ۔ ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ لئے ۔ ۔ ۔ ایک ملکوتی ادا کے ساتھ ۔ !!

"مغیرہ ۔ ! میری جان ۔ ! میری زندگی ۔ !" وہ بیقرار سا ہو کر اس کیطرف بڑھا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ۔ !!

"ٹھہرو ۔۔ ٹھہرو فواد ۔ !!" اس اچانک پیش قدمی سے گھبرا کر وہ چند قدم پیچھے ہٹی۔ "خدا کے لئے میرے اور قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!"

"ورنہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟؟" شدت جذبات سے اسکا رواں رواں سوال بن گیا۔

"پگلے ۔ ۔ ۔ ۔ ! اتنا بھی نہیں جانتے کہ روح مادی نہیں روحانی چیز ہے ۔ فانی انسان کے ایک دفعہ چھو لینے سے فوراً فضا میں تحلیل ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ اور تم عمر بھر سر پٹخنے پر بھی دوبارہ اسے دیکھ نہ پاؤ گے ۔ اس لئے احتیاط ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !! صبر ۔ !!" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور اور فواد کے قدم زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے ۔

"اتنا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ ۔ ۔ ۔ میرے ساتھ آؤ ۔ ۔ ۔ مگر مجھے چھونے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں کھو جاؤں گی ۔ ۔ ۔ ہمیشہ کے لئے ۔۔ !!" بڑی محبوبیت کے ساتھ وہ مسکرائی ۔

اور فواد کے ذہن میں پروفیسر کی نصیحت گونجنے لگی "تمہاری ذراسی بے احتیاطی اور جلد بازی پلک جھپکنے کی دیر میں معاملے کو بگاڑ سکتی ہے ۔"

اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ایک معمول کی طرح ۔ سحر زدہ سا۔ ! وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھی اور اس . . . حسین اپسرا کے فردوسی وجود سے اٹھنے والی بے نام سی مہک سارے میں پھیل کر فواد کو مخمور و بے خود بناتی چلی جا رہی تھی ۔

ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل لئے بڑی نرمی اور سبک رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی وہ اسے جھیل کی طرف لئے جا رہی تھی ۔

"مغیرہ ۔ میری روح ۔ ! میں بے حد تھک گیا ہوں ۔ زندگی کے طویل سفر میں تنہا چلتے چلتے چور ہو گیا ہوں ۔" فواد کے لہجے میں دکھ تھا۔ کرب تھا اور روح کو دیمک کی طرح چاٹ لینے والا احساس تنہائی بھی ۔ !

وہ خاموش تھی ۔ اداس اور چپ چاپ ۔ کچھ سوچتی ہوئی ۔ !!

دونوں جھیل کے کنارے پڑے ہوئے پتھروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے ۔ تھکے ہارے مسافروں کی طرح ۔ اور رات بھیگتی چلی گئی ۔ !!

"فواد ۔ ! یہاں جھیل میں کشتی رانی کا انتظام کیوں نہیں کرواتے ۔ ؟" اس عجیب سی فرمائش پر اس نے بغور مغیرہ کی طرف دیکھا ۔" اوہ . . . ! میرا مطلب ہے کہ میں تو روح ہوں ۔ زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد . . . کہیں بھی آجا سکتی ہوں . . . رہی کشتی وہ . . . تو محض تمہارے لئے . . . تاکہ تم میرے ساتھ آسانی سے جھیل کے پار جا سکو ۔ !" اس نے وضاحت کر دینا مناسب سمجھا ۔

فواد میں انکار کی ہمت کب تھی ۔ اگلے دن اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا ۔ پتہ نہیں

کہاں کہاں سے ملاحوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر منہ مانگی قیمت دیکر ایک خوبصورت سی، چھوٹی سی بوٹ "BOOT" خرید لی۔ مخملیں کشن اور گدے بازار سے خرید کر اس میں سجا دیے گئے تھے۔

آج رات کشتی لہروں کے سینے پر رواں دواں تھی اور مغیرہ کسی مشاق ملاح کیطرح کشتی چلاتی دوسرے کنارے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ چاند کی مدھم روشنی میں حسینۂ کوہسار کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ چہرے کا ہر تاثر ملکوتی رنگ لئے ہوئے دکھائی پڑتا تھا۔

"مغیرہ۔! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنی اچھی کشتی چلا سکتی ہو۔!" اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا فواد ایک عالم حیرت و استعجاب میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ آواز میں پیار، ستائش اور۔۔۔۔ پرستش کیا کچھ نہ تھا۔

"روح تو ہر چیز پر قادر ہے۔" انگریزی میں مختصر سا جواب ملا اور ایک زندگی بخش ہنسی کی آواز سارے میں پھیل گئی۔ فواد کو گھنٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

وہ بھی مسکرا دیا۔ روح کی ساری توانائیوں کے ساتھ۔!!

برسوں تاریکی میں بھٹکنے کے بعد روشنی کی ایک اچھوتی کرن نے دل کے تاریک ترین گوشوں کو بھی جگمگا دیا تھا شائد۔!

کشتی کے بہاؤ سے اٹھنے والی لہروں میں تاروں بھرے آسمان پر روشن چاند کا عکس جھیل کے شفاف پانی میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ ہواؤں میں خوشبو تھی۔۔۔۔۔۔ موسیقی تھی اور اس جادوئی ماحول میں فواد اور مغیرہ سحر زدہ سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔!!

اپنے آپ میں مگن وہ گنگنا رہی تھی۔ غیر شعوری طور پر۔ کوئی بہت ہی خوبصورت اور پیاری سی دھن۔

"کوئی فردوسی نغمہ ۔؟؟"

فواد کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ بہت ہی دلکش، سہانا اور رنگین سپنا۔!! برسوں کی پیاسی اور ترسی ہوئی روح کو قرار مل گیا تھا۔ دل کے گھاؤ مندمل ہو رہے تھے اور دل و دماغ پر چھائی ہوئی اداسیوں، محرومیوں اور غموں کی گہری دھند چھٹ رہی تھی۔ زندگی حسین نظر آنے لگی تھی۔ چنچل ۔۔۔ کسی الھڑ اور نوخیز محبوبہ کی طرح۔!!

وقت پر لگا کر اڑتا گیا۔ ایک صبا رفتار پرندے کی مانند۔!!

صبح کاذب سے کچھ ہی پہلے جب وہ حویلی کے قریب ایک برفپوش پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے تھے۔ مغیرہ نے فواد کو خدا حافظ کہا ۔۔۔ اور خود اس برفانی چوٹی سے ہی جھیل کے گہرے پانی میں کود گئی۔ بالکل اچانک۔!!

یہ جانتے ہوئے بھی کہ "روح ہر چیز پر قادر ہے۔" مغیرہ کی یہ غیر معمولی حرکت دیکھکر ایک لمحے کے لئے فواد کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے دل کی دھڑکنیں رکتی اور خون رگوں میں منجمد ہوتا ہوا محسوس کیا۔ "اف ۔۔۔۔!"

اس نے جھک کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن لہروں کی ہلکی سی آواز کے علاوہ کچھ بھی تو نظر نہ آیا۔ چاند غروب ہو چکا تھا نا۔!

فواد جیسے قدموں کو گھسیٹتا ہوا پہاڑی سے نیچے اترا۔ کسی کچلی ہوئی روح کیطرح۔! تکلیف میں مبتلا۔!!

سارا دن سر جھٹک جھٹک کر وہ دماغ میں زبردستی گھس آنیوالے اندیشوں اور وسوسوں سے جنگ کرتا اور ان سے پیچھا چھڑانے کی ناکام کوشش کرتا رہا مگر ۔۔۔۔ "وہ اتنی بلندی سے کود گئی ۔۔۔۔؟؟ اس قدر گہرے اور سرد پانی میں ۔۔۔۔؟ اور میں ۔۔۔۔ میں

صرف دیکھتا رہا.... ؟! بھود۔ ! تو کیا مجھے بھی کود جانا چاہیئے تھا..... ؟؟
ہاں.... ! نہیں... نہیں میں اتنا اچھا تیراک بھی تو نہیں..... ! تو کیا ہوا....
بزدل ۔! وہ لڑکی ہو کر.... مگر وہ .... وہ تو روح تھی ۔!! اس نے خود کو یقین دلایا۔
آج وہ پھر بے حد ڈسٹرب تھا.... ایسے میں اس کی کار کا رخ خواہ مخواہ پروفیسر صدیق علی خان کے بالاخانے کی طرف ہو جایا کرتا تھا.... غیر شعوری طور پر اس معاملے میں فواد نے اسے اپنا ایڈوائزر تسلیم کر لیا تھا۔ !

" بھلا اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے ۔ ؟ روح تو ایک لطیف شئے ہے اور ہر چیز پر قادر بھی. .... ! اس کے لئے جھیل کی گہرائی کیا اور پانی کی سردی گرمی کیا ۔ ؟ پروفیسر نے اس کی بات سنتے ہی جواب دیا۔

" شکر ہے کہیں تم اسکے پیچھے کودنے کی حماقت کر بھی نہیں گذرے ۔ تمہارے جیسے دیوانے سے یہ کچھ بعید بھی نہ تھا۔ آئندہ محتاط رہنا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ وہ روح ہے روح ۔! جسم کی قید اور زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد... اور تم محدود صلاحیتیں رکھنے والے اس فانی دنیا کے عام سے انسان ۔! بس اسکے اور اپنے درمیان اس فرق کو سمجھ لو، تمہیں کوئی بات بھی انوکھی اور غیر معمولی معلوم نہیں ہوگی ۔ "

مارچ کے دوسرے ہفتے کی ایک خوشگوار سی خنک چاندرات میں انہوں نے جھیل کے پار اتر کر کشتی کو کنارے پر اگے ہوئے درخت کے تنے سے باندھ دیا اور خود آگے چل دیئے ۔ فواد خوش تھا بے حد خوش ۔!!

خوش گپیوں اور قہقہوں کے جلو میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں چڑھتے اترتے وہ آبادی

سے کچھ دور بادام آڑوؤں اور سیبوں کے باغ میں پہنچ گئے۔
فواد باتیں کرتا رہا۔
ہجر و فراق کے قصے۔
ماضی کی محرومیوں اور بے چینیوں کی داستان اور
مستقبل میں ہمیشہ ملتے رہنے کے وعدے۔ سبھی کچھ ہوا۔
مغیرہ۔! اب اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں مر جاؤں گا۔ تمہارے بنا ایک پل بھی زندہ نہ رہ سکوں گا۔" ایک جذباتی نوجوان کی طرح وہ اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے فواد کی بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔
"میرے ساتھ وعدہ کرو جانم۔ کہ اب تم مجھ سے ہمیشہ ملتی رہو گی۔ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے تنہا نہیں چھوڑو گی۔ ہمیشہ ملو گی۔ اسی طرح۔!!"
برسوں پہلے کے الفاظ آج وہ پھر دہرا رہا تھا۔ وہ خاموش تھی۔
"مغیرہ۔! ہاں کہہ دو۔ میرے ساتھ وعدہ کرو۔!"
خاموشی۔
"بولو نا۔!"
ایک مدھم سی پراسرار مسکراہٹ مغیرہ گل کے ہونٹوں پر مچلی مگر وہ انکار تھا.... یا اقرار.... یہ فواد کی سمجھ میں نہ آیا۔
"جان۔! بولو نا۔ کچھ تو کہو۔ خدا کے لئے۔!"
مغیرہ کی معنی خیز خاموشی فواد کے اضطراب میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ خوفزدہ تھا۔ مستقبل میں تنہائی کے تصور سے۔!

"فواد۔! میرے دوست۔ !کاش یہ سب کچھ میرے اختیار میں ہوتا" مغیرہ نے دبی زبان سے اظہار بے بسی کیا۔" انسان تو قدرت کے ستم ظریف ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے جب جی چاہا، جیسے جی چاہا کھیل لیا اور پھر توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ کسی کو شکایت کی مجال نہ شکوے کی گنجائش۔!" وہ ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ فواد بھی چپ ہو گیا۔ مغیرہ کی اس فلاسفی کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی تھی۔

مغیرہ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ موضوع بدل دیا۔

حسین چاندرات، رومینٹک ماحول اور محبوب کا قرب۔!

زندگی مکمل ہو چکی تھی۔

اب فواد کو اکثر یہ شکایت رہنے لگی تھی کہ رات پتہ نہیں کیسے پلک جھپکنے کی دیر میں بیت جاتی ہے اور دن ۔ ۔ ۔ ۔ تو آج کل غیر معمولی طور پر ہی طویل ہوتے جا رہے ہیں۔ رات کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گذارنا مشکل ہوتا تھا۔ سال ہا سال تک تنہائیوں کے جہنم میں جھلستے رہنے کے بعد اب آ کر کہیں روح کو سکون نصیب ہوا تھا۔ مرجھائے ہوئے ہونٹوں نے مسکرانا سیکھ لیا تھا اور اب اسکی صحت پہلے سے کہیں بہتر تھی۔

اس کے دفتر کا عملہ حیران تھا کہ خلاف معمول آجکل وہ آفس ٹائم میں بھی اکثر چہکتا، مسکراتا اور بات بے بات دل کھول کر ہنستا نظر آتا تھا۔ اپنے عارضی گھر میں آنیوالے مہمانوں، بھائی بہنوں اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔

سب حیران تھے اس کے مزاج کی اس خوشگوار تبدیلی پر۔ بہن بھائی اور عزیز

دوست قیاس آرائیاں کرتے۔ وجہ پوچھتے مگر وہ مسکرا کر ٹال جاتا۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ۔۔!

پروفیسر صدیقی کے علاوہ اس مقدس راز میں کسی اور کی شرکت مغیرہ کی خواہش کے خلاف تھی اس نے سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اور۔۔۔ فواد اسے ناراض کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

بہار کی آمد آمد تھی۔

آلوچہ، خوبانی، آلو بخارا، بادام، سیب اور آڑوؤں کے ٹنڈ منڈ درختوں پر سفید اور ہلکے گلابی شگوفے پھوٹ نکلے تھے۔

باغوں، چشموں، آبشاروں اور بلند و بالا پہاڑوں کی سیر کرتے، محبت کے سرمدی نغمے الاپتے اور ہنستے کھیلتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے پیمان وفا باندھتے رہے۔ ایک دوسرے کو اپنی لافانی محبت کا یقین دلاتے رہے۔ نت نئے انداز میں۔!

بارہا چاندنی راتوں میں گڑھی در آدم خان کے لوگوں نے دور سے دو سایوں کو چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ حویلی کی روشوں پر، برآمدوں اور آس پاس کے مقامات پہ ان کی آوازیں اور قہقہے سنے تھے۔ جھیل کی سطح پہ تیرتی ہوئی کشتی میں دو انسانی ہیولوں کو دیکھنے والے چشم دید گواہ بھی موجود تھے جو قسمیں کھا کھا کر حویلی میں مقیم آسیب یا روحوں کی کہانیاں گڑھی کے سادہ لوح انسانوں کو سناتے نہ تھکتے تھے۔

لوگ یہ مبالغہ آمیز داستانیں بڑی توجہ کے ساتھ سنتے، ان پر ایمان لاتے اور پھر اپنے گھر کے افراد اور ساتھیوں کو حویلی یا جھیل کیطرف بالکل نہ جانے کی تاکید کرتے۔ بڑی سختی کے ساتھ۔! کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ تحقیق و تفتیش کی کوشش میں

اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔ ان کے لئے یہی غنیمت تھا کہ حویلی میں آباد رہیں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں۔

اکیسواں باب

"بیٹے ۔! اب شادی کر لو۔ میرے لال میں صرف تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزو میں جی رہی ہوں۔ چندا ۔! ہاں کہہ دو۔ تمہیں اپنے گھر میں آباد دیکھ کر میں چین سے مر سکوں گی۔!"

سب سے چھوٹے بھائی کی شادی پر وہ گھر گیا تو ماں نے آنسو بھری آنکھوں کیساتھ التجا کی۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"بھیا۔! ہم نے آپ کے لئے بڑے اونچے گھرانے کی چاند سی دلہن ڈھونڈھی ہے۔ اب صرف آپ کے ہاں کہنے کی دیر ہے۔" بہنوں نے تقاضا کیا۔

"بھائی جان ۔! اب یہ مسئلہ بھی طے ہو ہی جانا چاہیئے۔ وقت پہلے ہی کافی گذر چکا ہے۔" بھائیوں نے اصرار کیا۔

آج کھانے کی میز پر موقع پا کر سبھی نے اسے گھیر لیا تھا۔ بھائی، بھابیاں، بہنیں اور بہنوئی، سبھی اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق شادی کی ضرورت اور اہمیت پر اسے لیکچر پلا رہے تھے۔ اسے اپنے گھر میں شاد و آباد اور خوش و خرم دیکھنے کے آرزو مند تھے۔

یہ سب دیکھ کر بوڑھی ماں کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں باقاعدہ آنسو بہانے لگیں۔ ماحول خواہ مخواہ ہی کچھ بوجھل سا ہو گیا تھا۔

ان لوگوں کے پوائنٹس معقول تھے اور زوردار بھی۔ فواد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔

بحث و مباحثہ زوروں پر تھا۔ اُدھر سے اصرار، اِدھر سے انکار۔ وہ سب اسکے منہ سے "ہاں" کہلوانے کی کوشش میں اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

"ماں جی۔! کاش آپ کی یہ آرزو پوری کرنا میرے اختیار میں ہوتا۔" وہ دل و دماغ پر منوں بوجھ لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے چاند۔! یہ تمہارے اختیار میں ہی تو ہے۔ تم صرف ہاں کہہ دو باقی سب ہم پر چھوڑ دو۔"

"ہاں بھیا، ہماری ہونے والی بھابی تو بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ "مغیرہ شغیرہ" سب بھول جائیں گے۔" چھوٹی بہن سیمیں نے بڑی سادگی کے ساتھ اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"سیمیں ۔۔!" فواد کے لہجے میں فہمائش تھی اور آنکھوں میں سرزنش بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

اور دوسرے لمحے وہ ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔ بڑی ہی برق رفتاری کے ساتھ با اور۔ ۔ ۔ وہ سب گپ چپ تھے۔ کھانا تو آج بالکل بدمزہ ہو کر رہ گیا۔ موضوع ہی کچھ ایسا چھڑ گیا تھا۔

بڑی بھابی نے اس بوجھل خاموشی کو توڑنے میں پہل کی۔ اب سبھی سیمیں کو ڈانٹ رہے تھے۔

"بھلا اس موقع پر مغیرہ گل کا ذکر چھیڑنے کی کیا تک تھی۔؟" بڑی بہن نے کڑی نگاہوں کے ساتھ سیمیں کو دیکھا۔

"حماقت اور کیا۔ ۔ ۔ ۔ ہزار بار کہا ہے کہ ہر موقع پر اوور سمارٹ بننے کی کوشش نہ کیا کرو"
منجھلے بھیا کے ماتھے پر ہمیشہ پڑی رہنے والی لکیریں کچھ اور بھی گہری ہو گئیں۔
"قسم خدا کی حامد بھائی ۔ ۔! اگر یہ سیمیں ایسے احمق پن کا ثبوت نہ دیتی تو آج ہم بھائی جان کو منانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔" یہ سب سے چھوٹا بھائی تھا۔
آصف ۔ ۔!

سیمیں روہانسی ہو رہی تھی۔ بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلی ہوئی معمولی سی بات پل بھر میں اسے مجرم بنا کر رکھ دے گی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا۔ کسی ناکردہ گناہ مجرم کی طرح ۔ ۔!!
"بیٹا ۔ ۔! اس میں سیمیں بیچاری کا کیا دوش ۔ ۔ ؟ یہ تو سب مقدر کے کھیل ہیں ۔ پتہ نہیں میرے مولا کو کیا منظور ہے ۔ ۔ ؟" ماں دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں اور فواد کے یوں اٹھ کر چلے جانے سے باقی سب کی بھوک بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے بھی ایک ایک، دو دو لقمے زہر مار کئے اور میز سے اٹھ گئے۔

مغیرہ گل کی روح سے ملنے کے بعد آج یہ پہلی رات تھی کہ فواد حویلی سے دور تھا۔ بھائی کے نکاح سے فارغ ہو کر اس نے بھاگنے کی بہتیری کوشش کی لیکن ماں کے آنسو اور بھائی کا اصرار نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پاؤں میں بیڑیاں بن گیا۔ وہ رک گیا۔ رکنا پڑا ۔ ۔! دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کے ہجوم میں

گھرا وہ بے بس سا کھڑا تھا۔ "مغیرہ میرا انتظار کر رہی ہو گی" وہ سارا دن اور ساری رات وہ کھویا کھویا سا رہا۔ صرف ایک وجود اور اس کا تصوّر۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ، ہر گھڑی وہ آواز . . . . وہ گیت . . . . وہ مسکراہٹیں اور کافرانہ ادائیں . . . اس کے ذہن پر چھائی رہیں۔ اس پر مسلط رہیں۔

کوشش کے باوجود وہ رات بھر سو نہ سکا۔ نیند آتی بھی تو کیسے۔ وہ تو گذشتہ کئی ماہ سے رات کو کبھی سویا ہی نہ تھا ہاں دن کے وقت دوپہر میں سو کر وہ اپنی نیند ضرور پوری کر لیا کرتا تھا لیکن آج . . . اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ گذر چکے تھے اور فواد نے پلک تک نہ جھپکی تھی۔ بس اسے تو ایک ہی دھن تھی اور ایک ہی خیال۔ مغیرہ۔ مغیرہ گل کی روح۔!

مجھے جانا ہے۔ جلد وہاں پہنچنا ہے۔ رات تک، ضرور۔!!

"بیٹا۔! اس منحوس حویلی کے آسیب کا سایہ دور کرنے کے لئے میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ سے تمہارے لئے یہ تعویذ لائی ہوں۔ میرے چاند۔! اسے پہن لو تاکہ تم ان تمام بلاؤں سے محفوظ رہو۔" رخصت کے وقت ماں نے تعویذ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ "ایک تعویذ میں نے دودھ میں گھول کر ملا دیا ہے۔ یہ پی لو۔ اللہ تمہاری مشکلیں آسان کرے میرے بچے۔!" ماں کے رندھے ہوئے گلے سے بمشکل نکل سکا۔ اس نے دودھ کا گلاس تھام لیا۔ محض ماں کا دل رکھنے کی خاطر۔!

"دراصل فواد بھائی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔ میں انہیں مینٹل ہاسپٹل کے کسی سپیشلسٹ کو دکھانے کے متعلق سوچ رہا تھا مگر وہ تو یہاں ٹکتے ہی نہیں۔" ساتھ والے کمرے میں منجھلا بھائی بڑی بہن سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے بھائی جان (بہنوئی) کا بھی یہی خیال ہے۔ ابھی کل ہی وہ کہہ رہے تھے کہ فواد بھائی نفسیاتی مریض ہیں اور میں انہیں کسی ماہر نفسیات کو دکھانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔" بہن نے تشویش ظاہر کی۔ "ایک بہترین سائیکاٹرسٹ ان کا دوست بھی ہے اسی کو دکھائیں گے شائد۔"

"ہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ورنہ اس طرح کب تک گذارا ہو گا۔؟ بہر حال میں جلد ہی کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گا۔" منجھلے بھائی نے ٹائی کو آخری گرہ لگائی۔

"بھائی جان نے ہمارے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔" بہن کا سارا خلوص اور پیار کا ہر جذبہ اس کے اس ایک جملے میں سمٹ آیا تھا۔ "کاش ہم بھی ان کیلئے کچھ کر سکتے۔!"

"اچھا امی۔! میں تو چلا۔ خدا حافظ۔!" فواد کی آواز سن کر دونوں بہن بھائی کمرے سے نکلے تو فواد اپنا اٹیچی کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ بالکل تیار۔

"بھائی جان۔! پھر کب آرہے ہیں۔؟" حامد نے پوچھا۔

"چند ہفتوں کے بعد کوشش کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔" اس نے قدم بڑھایا۔

"لائیے یہ اٹیچی کیس مجھے دیدیجئے۔ میں اٹھا لیتا ہوں۔" حامد نے فواد کے ہاتھ سے اٹیچی کیس پکڑ لیا۔

"اللہ کی امان میرے لال۔! خدا تمہیں سکون اور خوشیاں عطا کرے۔!" ماں کے دل سے دعا نکلی۔ وہ سب اسکے ساتھ برآمدے میں نکل آئے تھے۔

فواد نے پورچ میں کھڑی کار میں بیٹھ کر سٹیئرنگ سنبھال لیا اور حامد نے دروازہ کھول کر اٹیچی کیس پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل۔!

ماں کو دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں خشک کرتے دیکھ کر بڑی بہو نے ساس کو سہارا دیا۔ "آیئے اماں کمرے میں چلیں۔"

مرے مرے سے قدم اٹھاتی وہ بہو کے سہارے کمرے میں آئی اور پلنگ پر لیٹ کر چادر میں منہ چھپالیا۔ کسی سے کوئی بات کئے بغیر۔!

سبھی فواد کی کیفیت کو سمجھتے تھے اور ماں کے دل کا حال بھی جانتے تھے مگر.....

دلی پریشانی کو چھپانے کے لئے باپ نے حقے کی نے منہ میں دبالی۔ فواد کے مرض کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔

"اب کے بھائی جان آئے تو میں انہیں ضرور کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ خواہ مجھے ان پر زبردستی ہی کرنی پڑے۔" حامد نے باپ کی کیفیت سمجھتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

اس روز جب مغیرہ گل فواد سے ملنے آئی تو خلاف معمول اسکی ہر ہر بات اور ہر ہر حرکت سے اداسی اور سوگواری ٹپکی پڑتی تھی...... وہ کچھ مضطرب اور بے چین سی دکھائی پڑتی تھی۔ فواد بے حد پریشان تھا اس کا یہ رویہ دیکھ کر۔ وہ اسکے ساتھ دیر تک گھومتی رہی... حویلی کا ایک ایک کمرہ.... ایک ایک حصہ اس نے

بغور دیکھا۔
حویلی کے وسیع و عریض صحن میں وہ رک گئی۔ . . صحن میں تھوڑے سے فاصلے پر پھوٹتے ہوئے دو تین قدرتی چشموں کے پاس۔ زمین کے سینے سے پھوٹتی اور ابلتی ہوئی پانی کی یہ ننھی منی دھاریں کس قدر اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ کتنا نیا اور انوکھا پن تھا ان میں۔ حویلی کے صحن سے پھوٹتے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے چشمے..... ان کا چاندی کی طرح جھلملاتا ہوا سفید اور شفاف پانی۔ . . جو دھرتی ماں کا سینہ چیر کر پھوٹ نکلا تھا۔ خود بخود. . . . . اور اب پتھریلی زمین پر اپنا راستہ بناتا. . . باغ کے مختلف حصوں میں سے گذرتا ہوا جا کر جھرنے کے پانی میں شامل ہو گیا تھا اور وہاں. . . . ایک چھوٹی سی ندی بن گئی تھی. . . . . سرکش اور منہ زور تند و تیز ندی. . . جسے کود کر یا زیادہ سے زیادہ درمیان میں ابھرے ہوئے پتھروں پر پاؤں رکھ کر بآسانی پار کیا جا سکتا تھا۔ جھرنے اور تین ننھے منے چشموں کے پانی سے مل کر بنی ہوئی یہ ندی باغ میں سے ہوتی ہوئی لہراتی بل کھاتی سیدھی جھیل میں جا کر جذب ہو جاتی تھی۔

مغیرہ گل یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ بڑی ہی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ۔! وہ چلتے رہے۔ روش روش. . . . جھیل، باغات اور حویلی سے ہوتے ہوئے کافی دور آبشار کے کنارے آ نکلے۔

سارے راستے فواد سے اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ خاموش تھی. . . . اداس اور. . . . چپ چاپ۔!

گم سم سی۔ سوچ میں ڈوبی ہوئی۔

کھوئی کھوئی اور پریشان سی ۔!!
فواد کے تمام سوالات اور باتوں کے جواب میں بھی ایک مختصر سی "ہوں۔ہاں" کہہ کر وہ پھر چپ سادھ لیتی ۔فواد حیران تھا اس کا یہ بے حد عجیب و غریب سا طرزِعمل دیکھ کر ۔!

"مغیرہ ۔! ڈارلنگ ۔! تم مجھ سے ناراض ہو ۔میں جانتا ہوں ۔ مگر میں کیا کروں ۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چھوٹے بھائی کی شادی ہے اس سے پہلے سارے بھائی بہنوں کی شادیوں کے موقع پر میں ملک سے باہر تھا اس لئے شرکت نہ کرسکا لیکن ۔ ۔ ۔ اب ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر وہاں سارا خاندان جمع تھا۔سب کے اصرار پر مجبوراً مجھے وہاں دو دن تک رکنا پڑا۔تم ناراض ہوگئیں ۔مجھے معاف کر دو۔میں جانتا ہوں کہ تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا ۔ میری جان ! غصّہ تھوک دو۔میں نادم ہوں ۔" وہ اسکی منتیں کر رہا تھا۔ اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر ۔!

مغیرہ نے چھلکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ فواد کی طرف دیکھا اور پلکیں جھکالیں ۔ آنسوؤں کے موتی گالوں سے لڑھکتے ہوئے جاکر اس کے لباس میں گم ہوگئے ۔ فواد بے چین ہوگیا۔ اسکے ہاتھ اٹھے ۔ ۔ ۔ ۔ مغیرہ کی طرف بڑھے اور پھر کسی نامعلوم اندیشے کے تحت پیچھے ہٹ گئے ۔

"مغیرہ ۔! مجھے معاف کردو۔خدا کے لئے کوئی بات کرو ۔ مجھے اس خاموشی سے وحشت ہوتی ہے ۔" وہ گڑگڑایا۔

مغیرہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہونٹ لرز کر رہ گئے۔اس نے منہ پھیر لیا اور ہونٹ بھینچ لئے ۔

"آخر بات کیا ہے۔۔؟؟ جان۔! کچھ بتاؤ تو سہی۔" وہ اس کے قریب آگیا۔ بےخود سا ہو کر۔

وہ چپ تھی۔

ان گنت سوالات کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ خاموشی۔۔!

اس گھمبیر اداسی اور گہری خاموشی کا مفہوم سمجھنا فواد کے لئے مشکل تھا۔۔ بلکہ ناممکن سا مجبور ہو کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔

باقی ساری رات وہ گھومتے رہے۔

یونہی۔

بے مقصد۔

ادھر سے ادھر۔۔!!

اس چاندنی رات کے پچھلے پہر جب مغیرہ کا موڈ قدرے بہتر تھا اور وہ آلو بخارا، بادام، خوبانی اور آلوچے کے نرم و نازک شگوفوں سے لدے پھندے درختوں کے پاس آبشار کے کنارے بیٹھے تھے فواد اسے ایام جدائی میں پیش آنے والی تنہائیوں اور اذیتوں کی روداد سنا کر تجدید عہد اور پیمان وفا باندھ رہا تھا۔ اپنے زمانۂ یورپ و امریکہ کے حالات سنا رہا تھا اور ساری عمر اس کے ساتھ یونہی بتا دینے کے عزم کا اظہار کر کے اس سے ہمیشہ ملتے رہنے کا وعدہ لینا چاہتا تھا پر وہ۔۔۔۔۔ وہ تو اس پوائنٹ کی طرف آ ہی نہ رہی تھی۔ اسے ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

فواد تھک کر خاموش ہو گیا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔

گذشتہ کئی ملاقاتوں میں مختلف مواقع پر مغیرہ کی قربت میں بارہا اس کے اندر کا مرد بیدار ہوا تھا۔ . . . مغیرہ کو چھونے، اسے پیار کرنے اور ہر لمحہ اس کی رفاقت میں گذارنے کی آرزو بھی اکثر اسے بے چین کر دیا کرتی تھی لیکن . . . پھر اس خوبصورت آرزو، جذباتی ہیجان اور مچلتے ہوئے نٹ کھٹ دل کے اس شدید تقاضے پر ایک خوف غالب آجاتا۔ مغیرہ کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جانے کا خوف۔!!

اور وہ پھر اپنے مقام پر واپس آجاتا کہ عرصہ دراز تک جدائی کے صدمے اور تنہائی کی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد اب فواد میں اتنی سکت نہ رہی تھی . . . . . .

وہ کوئی ایسا قدم اٹھانے یا کوئی ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا جو مغیرہ کو اس سے ہمیشہ کے لئے دور کر دے۔ اسے چھین لے۔!!

اسے ایک بار چھو کر ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو جانے کی بجائے وہ اپنی ساری زندگی اسکے ساتھ یونہی بتا سکتا تھا۔

اسی ایک خوف کے زیر اثر اس نے برسوں کے تڑپتے اور مچلتے ہوئے جذبات پر صبر و ضبط کے بند باندھ رکھے تھے۔

امڈتے ہوئے جذبات پر برف کی سل رکھ دی تھی۔

خود پر کنٹرول کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا پر آج . . . . آج مغیرہ کی یہ حالت . . . . یہ خاموشی . . . . یہ بےچینی اور اضطراب دیکھ کر اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"مغیرہ۔! مجھے ڈر ہے کہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر آج میں کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہ کر بیٹھوں۔" بالآخر اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔ "مجھے سنبھلنے میں مدد دو۔"

وہ بھی اسکی اس وارفتگی اور جنونی کیفیت کا خوب اندازہ لگا چکی تھی ..... انتہائی پریشانی اور تفکرات کے واضح آثار اس کے چہرے پر پڑھے جا سکتے تھے ۔!

صبح کا ستارہ طلوع ہوا ۔

مغیرہ نے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے پلکوں کی جھالر اٹھا کر اس مجسمۂ خلوص و وفا اور ایثار و قربانی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور .... پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی ۔ امڈتے ہوئے جذبات پر قابو پانا اور آنسوؤں کے طوفان پر کنٹرول کرنا اب اس کے بس کی بات نہ رہی تھی ۔

"مغیرہ ۔! مغیرہ ۔!"

وہ بیقرار تھا ۔ اسے اپنے بازوؤں میں لیکر اپنے سینے میں جذب کر لینا چاہتا تھا ۔ دل میں چھپا لینا چاہتا تھا ۔ اس میں تحلیل ہو جانا چاہتا تھا لیکن .. حکم عدولی ..... اور اس کے بعد ..... ہمیشہ کی جدائی ۔!!

جنم جنم کا ترسا ہوا اور پیاسا فواد اس تصور ہی سے کانپ اٹھا ۔

اٹھے ہوئے بازو بے جان سے ہو کر نیچے گر گئے مگر ۔ مگر یہ کیا ۔ ؟؟؟

دوسرا لمحہ اسکے لئے مسرتوں اور حیرتوں کی انتہا لئے ہوئے آیا ... ناقابل یقین تسکین و راحت ۔ جنت کے تمام دروازے کھل گئے تھے ۔

آج ..... وہ ..... وہ خود بازو پھیلائے کھڑی تھی ..... مغیرہ گل ..... اس کے پھیلے ہوئے بازو فواد کے منتظر تھے ۔!!

فواد نے آنکھیں مل مل کر دیکھا ۔ "خواب ۔ ؟ ایک سہانا اور رنگین سپنا .....؟"

اور یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ۔ یہ دلکش خواب تو وہ برسوں سے دیکھتا چلا آیا تھا

اور سچ تو یہ ہے کہ انہی دلفریب خوابوں کے سہارے حوادثات زمانہ کا مقابلہ کرتے کرتے اس نے ایک عمر بنادی تھی۔

"فواد۔!" نغمہ بار فردوسی لہجہ۔! وہ ابھی تک بازو پھیلائے کھڑی تھی۔

"نہیں..... نہیں.....!" فواد کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

وہ بازو پھیلائے پھیلائے آگے بڑھی..... سحر زدہ سا فواد رکا..... جھجھکا اور پھر بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو گئے تھے۔ سرور و سکون کی یہ لہر کچھ اتنی اچانک اور زبردست تھی کہ انتہائی مستقل مزاج اور مضبوط اعصاب کا ایک صحت مند مرد ہونیکے باوجود فواد پر ایک عجیب بے خودی..... مدہوشی یا شائد سکون کی گہری نیند سی طاری ہونے لگی۔

وقت کی پرواز تھم چکی تھی اور وہ..... اسکے سینے پر سر ٹکائے، مدہوش و سرشار اس کے بازوؤں میں پڑا ہوا تھا۔

جانے کتنے ہی لمحے اسی عالم سرور و مستی میں دبے پاؤں رینگ گئے۔

"اللہ اکبر۔! اللہ اکبر۔!" دور کہیں..... آبادی کی چھوٹی سی مسجد سے موذن کی آواز پہاڑوں میں گونجی۔ مغیرہ گل نے بڑی ہی نرمی اور پیار کے ساتھ سہارا دے کر اس دیوانے کو گھاس پر لٹا دیا۔

وہ جھکی۔ اور فواد کی پیشانی، ہونٹوں اور آنکھوں پر پیار کی بارش کر دی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور آنسو فواد کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔!! بھگو رہے تھے۔!!

اور برسوں کا تھکا ہارا مسافر نخلستان میں پہنچ کر سکون کی گہری نیند سو رہا تھا۔ اسکی پیاسی روح سکون و سرور کی ان لامحدود وسعتوں میں پرواز کر رہی تھی جہاں پرندے محبت کے گیت گاتے ہیں اور روح پیار کے فردوسی نغموں میں کھو کر وقت کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔!!

بائیسواں باب

فواد کی آنکھ کھلی تو سورج سر پر آچکا تھا اور فلک بوس برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر سنہری کرنوں کی پریاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ قریب ہی گنگناتے ہوئے آبشار میں سیال چاندی بہہ رہی تھی اور آس پاس کے سبز پوش درختوں اور خودرو پودوں پر کلیاں اور شگوفے جھوم رہے تھے۔

فواد نے ایک طویل انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کے حسین حادثے کا خمار ابھی تک اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا، کوٹ کندھے پر ڈالا اور دھیمے سروں میں گنگناتا ہوا انسانیہ کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔

رات کے انتظار میں یہ دن اسکے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ وہ ایک ایک پل ایک ایک منٹ گن گن کر گذار رہا تھا۔ آج تو روح کو اتنی غذا مل گئی تھی کہ بھوک پیاس کا احساس تک مٹ گیا۔ دن بھر اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ ہاں انسانیہ کے اصرار پر چائے کی ایک دو پیالیاں ضرور پی لی تھیں۔ انسانیہ حیران تھی کہ خلاف معمول آج فواد نے سارا دن وہیں گذارا تھا۔ وہ خوش تھا۔ غیر معمولی طور پر — ! کیوں — ؟ اس کے پوچھنے پر بھی فواد نے کچھ نہ بتایا تھا۔

وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتا لیکن لگتا تھا کہ سورج وہیں کا وہیں کھڑا ہے اور فواد کا بس نہ چلتا تھا کہ نظام قدرت اپنے ہاتھ میں لیکر سورج کو نکلنے سے پہلے ہی

غروب کردے۔

آج سرِشام ہی اس نے حویلی کی روشوں اور برآمدوں میں چہل قدمی شروع کردی تھی۔ بار بار وہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتا پر سوئیوں کی رفتار بھی جیسے تھم سی گئی تھی۔ ایک دفعہ تو جھنجھلا کر اس نے تین گھنٹے پہلے ہی رسٹ واچ کی سوئی کو بارہ کے ہندسے پر پہنچا دیا اور ...... پھر خود ہی مسکرا دیا اپنی اس بچگانہ حرکت پر۔

سوئی پھر نو کے ہندسے پر پہنچ گئی۔ وہ ایک ایک سیکنڈ گن رہا تھا۔ بارہ بجے کے قریب وہ سگرٹوں کا ایک پورا ٹن خالی کر چکا تھا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ فواد کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ہر آواز اور ہر آہٹ پر وہ چونک اٹھتا.... ہوا کی سرسراہٹ پر اسے مغیرہ کے لباس کی سرسراہٹ کا گمان گذرتا مگر.... مگر....

ایک بج گیا۔

دو بجے۔

اور اس کے بعد تین بھی بج گئے۔

اسے نہ آنا تھا، نہ آئی۔!

اندیشے، وسوسے اور الٹے سیدھے خیالات۔! اس کی بے چینی و بیقراری جھنجھلاہٹ غصے اور پشیمانی میں تبدیل ہونے لگی۔ ذرا سی آہٹ.... ہلکی سی آواز پر اسکی روح جیسے کھینچ کر آنکھوں میں سمٹ آتی۔ کانوں کی لویں سرخ ہو جاتیں اور دل کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہونے لگتیں۔

چار بج گئے۔

دور آبادی کی مسجد سے اذان کی صدائے دلنواز نے صبح ہونے کا اعلان کر دیا۔
انتظار، مایوسی اور پشیمانی کے صدمے سے نڈھال فواد صبح تک تقریباً نیم پاگل نظر آ رہا تھا۔

دوسری رات کے بعد تیسری اور پھر چوتھی رات بھی گذر گئی پر.... حویلی کے در و دیوار خاموش تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور دل میں امید کی ہر شمع گل کر دینے والی تاریکی۔! اس پر وحشت طاری تھی۔ وہ اکیلا حویلی کے گوشے گوشے میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ .... آس پاس کے علاقوں کے چکر لگا رہا تھا۔ پریشان اور تباہ حال۔! سردی، گرمی یا بھوک پیاس کا ہر احساس اس لئے بے معنی ہو چکا تھا۔!!
اجڑے ہوئے خشک بال۔!
میلے کپڑے۔
بڑھی ہوئی شیو اور سرخ سرخ آنکھیں۔
سگرٹ.... سگرٹ اور.... صرف سگرٹ۔!!
نمونیے کی ایک لمبی بیماری سے النسانیہ گو صحت یاب ہو چکی تھی تاہم کمزوری ابھی باقی تھی۔ اسکی کمزور صحت اور مغیرہ گل کی روح سے اپنی ملاقاتوں کا حال چھپانے کی خاطر فواد نے اسے راتوں کو حویلی کی طرف آنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ وہ خود ہی جھونپڑی میں اسکے پاس جاتا، کھانے پینے کی اشیاء، دوائیں اور گرم کپڑے اس کے حوالے کرتا۔ اسکے ساتھ کچھ وقت گذارتا۔ اسے کھلاتا پلاتا اور پھر ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق مکمل آرام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اسے بڑے احترام اور پیار کے ساتھ لٹا کر حویلی میں آ جایا کرتا تھا۔

فواد کی لائی ہوئی اشیاء کا ایک اچھا خاصا سٹاک انسانیہ کی جھونپڑی میں اکٹھا ہو چکا تھا۔ اتنا کہ اب وہ کئی ہفتوں کے لئے کھانے پینے کی مزید اشیاء کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

"مگر یہ فواد آج بھی نہیں آیا۔ ؟ کیوں۔ ؟؟" وہ سوچ رہی تھی۔ لیٹی ہوئی۔

دراصل جب سے فواد آیا تھا ایک رات کا ناغہ بھی نہیں ہوا تھا اور اب بغیر کسی اطلاع کے اکٹھی دو راتیں۔ ؟؟ خلاف توقع دو پہاڑ سی راتیں گذر گئیں۔ انسانیہ انتظار کرتی رہی۔ گھڑی گھڑی اور پل پل۔

فواد... وہی تو اس کا واحد سہارا تھا... تنہا اور ویران زندگی میں... روشنی کی ایک کرن... ! اور وہ اس کے وجود کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ جب مزید انتظار کی تاب نہ رہی تو ڈاکٹر کی ہدایات کو بھول بھال کر وہ اس کی تلاش میں نکل آئی۔ حویلی کا ایک ایک کونہ ڈھونڈتی، اسے تلاش کرتی آخر وہ اس کے پاس پہنچ گئی لیکن....

فواد.... اس حال میں.....؟؟

اسکی خستہ حالی اور درماندگی کا یہ عالم دیکھ کر اس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

ایک حقیقی ماں کی طرح۔ !

"میرے بچے۔ ! میرے لال۔ ! تمہاری یہ حالت۔ ؟؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور پھر اپنے محسن... اپنے دوست کی دیکھ بھال کو اس نے اپنا معمول بنالیا۔

اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس نے فواد کی دیکھ بھال اور دلجوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

انسانیہ کے بے حد اصرار پر بھی وہ کسی صورت جھونپڑی میں جاکر اسکے پاس رہنے پر تیار

نہ ہوا تو وہ اس کے لئے کھانے کی اشیاء انڈے، پنیر، مکھن، ٹوسٹ، ہنٹر بیف، بسکٹ، فروٹ اور جانے کیا کیا الابلا وہیں اٹھا کر لے آئی۔ ایک مشفق ماں کی طرح ..... بڑے پیار سے، نرمی سے .... اور منت سماجت سے اس نے فواد کو کچھ کھلانا چاہا۔ ضد کرتی رہی پر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

سمجھانے بجھانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کر انسانیہ نے عورت کا آخری ہتھیار استعمال کیا۔ آنسو۔!!

" اچھا بیٹے۔! تمہاری مرضی .... بوڑھی ماں کا زور ہی کیا۔ لیکن یہ سن لو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گی۔ تمہیں اس حال میں بھوکے پیاسے دیکھ کر میرے حلق سے بھی کچھ نیچے نہیں اتر سکتا۔" رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اس نے فواد کو بھوک ہڑتال کی دھمکی دیدی تھی۔

انسانیہ کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ پگھل گیا۔ موم کی طرح۔!! اس کے بعد انسانیہ کے اصرار پر وہ ہر روز کچھ نہ کچھ ضرور کھا لیتا تھا۔ ایک آدھ انڈا، کچھ بسکٹ یا کوئی اور چیز۔ دن میں کئی کئی بار وہ کنڈنسڈ ملک سے تیار کی ہوئی کافی یا چائے بھی اس کے لئے وہیں لے آتی تھی۔ ہر دفعہ ساتھ میں کوئی نہ کوئی چیز ہوتی۔ ضد کر کے بڑے پیار سے وہ اس کو کھلاتی اور اسکے بعد خود کھاتی۔ فواد کو انسانیہ کا ساتھ دینا پڑتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ کہ مغیرہ گل کی ماں کو اپنے ساتھ بھوکا نہیں مارا جا سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی بوڑھی اور کمزور تھی۔ اس بیماری نے اور بھی ضدی بنا دیا تھا۔ اس لئے فواد کچھ نہ کچھ ضرور کھا لیتا۔ ماں کی خاطر، کیونکہ اس کے بغیر وہ ایک نوالہ بھی حلق سے نیچے نہ اتارتی تھی۔

انسانیہ کے اصرار پر فواد نے اسے مغیرہ کی روح کے متعلق بتا دیا تھا.... لیکن اس کی وحشت و دیوانگی دیکھ کر وہ اپنا آپ بھول چکی تھی اس کا بس نہ چلتا تھا کہ فواد کے سارے دکھ خود سمیٹ لیتی۔

انسانیہ دیکھ رہی تھی کہ گذشتہ تین چار روز سے اکثر وہ اسی آبشار کے کنارے بیٹھا رہتا تھا جہاں مغیرہ گل کی روح سے اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ دوسرے مقامات کے بھی چکر لگاتا۔ پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا اور ہوا کی سرگوشیوں کو مغیرہ گل کی سرگوشی سمجھ کر اپنی جگہ سے اچھل پڑتا یا پھر... جنون و وحشت کے عالم میں اسے آوازیں دینے لگتا۔ بڑی بلند آوازیں جس کی بازگشت پہاڑوں میں سنی جا سکتی تھی۔ کبھی وہ اس لمحے کو کوستا جب پروفیسر صدیق علی خان کی ہدایات کو فراموش کر کے وہ مغیرہ گل سے ہم آغوش ہو گیا تھا۔ اس نے مغیرہ گل کی حکم عدولی کی تھی.... وہ تو اسے آزما رہی تھی شائد لیکن.... لیکن وہ اپنی حدود کیوں نہ پہچان سکا ـــ؟ اور اب وہ چلی گئی تھی۔ ہمیشہ کے لئے۔ اس سے روٹھ کر۔ اب زندگی میں رہ ہی کیا گیا تھا.... سوائے ایک جان لیوا اداسی اور تنہائی کے ـــ!! پھر وں وہ سوچتا۔ عجیب عجیب سی باتیں ـــ!!

اس کے خاندان کے افراد اسے تلاش کرتے کرتے حویلی تک آ پہنچے تھے۔ کئی دنوں سے بیٹے کی طرف سے خیریت کی کوئی اطلاع نہ پا کر ماں کے آنسو ان کو وہاں کھینچ لائے تھے۔ فواد کی ابتر ذہنی حالت دیکھ کر ماں کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ بہن بھائی الگ پریشان تھے۔

فرداً فرداً سب نے سمجھا بجھا کر اسے گھر لیجانے کی کوشش کی مگر وہ کسی کی بات

سننے کو تیار کب تھا۔
"بھائی جان۔ ! میں پوچھتا ہوں آخر منیزہ کا یہ منحوس بھوت کبھی آپ کا پیچھا بھی چھوڑے گا یا نہیں۔ ؟" حامد کے انداز میں جھلاہٹ تھی۔ منت سماجت کی ساری کوششوں میں ناکام ہو کر وہ سختی پر اتر آیا تھا۔
"تڑاخ۔"
حامد کے گال پر فواد کے لگتے زبردست اور بھرپور طمانچے کو دیکھ کر ہر شخص گنگ سا ہو گیا تھا۔ فواد کی سرخ سرخ آنکھیں انگارے سے برسا رہی تھیں۔ وہ چھوٹے بھائی کا یہ گستاخانہ انداز گفتگو برداشت نہ کر سکا تھا۔ اس نے مغیرہ گل کی توہین کی تھی۔ فواد کی محبوب ترین ہستی کی توہین۔ !! فواد کا خون کھول گیا۔ حامد کی اس بدتمیزی پر اور اب . . .
اب اس نے بھائی کو اس بدتمیزی کی اچھی سزا دیدی تھی . . . . . یہ سوچے بغیر کہ حامد اب ننھا بچہ نہیں بلکہ ایک ذمے دار سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہے اور کئی بچوں کا باپ بھی۔ !
فواد کی یہ حالت اور مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر کسی کو مزید کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔
ہر کوشش اور ہر حربے میں ناکام رہنے کے بعد تڑپتی اور بلکتی ہوئی ماں نے نمازوں، دعاؤں اور وظیفوں کا سہارا لیا۔ مغیرہ کی روح کے جادو کا اثر دور کرنے کی خاطر گنڈے تعویذ حاصل کرنے اور منتیں ماننے کے لئے وہ ہر پہنچے ہوئے بزرگ کے مزار پر پہنچی۔ زندہ یا مردہ پیروں، فقیروں اور مجذوبوں کے حضور حاضری دی۔ گھنٹوں وہاں نفل پڑھنے کے بعد آہ وزاری کے ساتھ دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا مگر ہر چیز رائیگاں جاتی نظر آتی تھی۔
فواد کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی پر . . . وہ کسی صورت بھی حویلی چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

تئیسواں باب

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔

فواد کی حالت میں قطعاً کوئی تبدیلی نہ آئی۔ سمجھانے بجھانے اور منت خوشامد میں ناکام ہو کر سب نے شکست تسلیم کر لی اور فواد کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ حویلی چھوڑ کر گھر جانے کو تیار نہ تھا اور باقی لوگوں کے لئے ایسی جگہ پر ٹھہرنا ناممکن۔ مجبوراً سب واپس چلے گئے۔

ہفتے میں ایک دو مرتبہ ضرورت کی دوسری چیزیں اور کھانے پینے کی اشیاء کا اچھا خاصا سٹاک لیکر گھر سے کوئی نہ کوئی فواد کو دیکھنے آجاتا۔ . . . سارا دن اس کے ساتھ گذارتا اور شام کو واپس ہو جاتا۔ عمر رسیدہ والدین کی تسلی کے لئے بھائی اور بہنوئی ہی کچھ کر سکتے تھے۔

گردش صبح و شام کا سلسلہ جاری رہا۔ . . . انسانیہ بڑی باقاعدگی، توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنے محسن کی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دیتی رہی۔! ادھر اس چھوٹی سی بستی سے دور . . . ایک بڑے شہر میں . . . بوڑھی ماں کی گریہ وزاری، منتوں، دعاؤں وظیفوں اور تعویذ گنڈوں میں بھی کوئی کمی نہ آئی اور . . . یونہی کائنات اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔

موسم بہار کے آغاز کے ساتھ سڑکوں اور وادیوں میں پھیلی ہوئی برف کب کی پگھل

چکی تھی۔ راستے صاف ہو گئے تھے اور وادی میں سیاحوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔

یہ بہار کا ایک خوبصورت، روشن اور خوشگوار دن تھا۔ چیڑ، چنار اور یوکلپٹس کے جھومتے ہوئے درختوں کی سرسراہٹ پر موسیقی کی کسی روح پرور دھن کا گمان ہوتا تھا۔ ڈال ڈال پھدکتے ہوئے پرندے ایک عجیب عالم سرخوشی میں اپنے اپنے ترانے الاپ رہے تھے۔ . . جھیل کے گہرے نیلے پانی میں بل کھاتی ہوئی لہریں اپنے ازلی اور ابدی کھیل میں مشغول تھیں اور ایک طویل سلسلۂ کوہ کے پیچھے سے شہنشاہ خاور کا روشن و تاباں چہرہ جھانک رہا تھا۔

انسانیہ فواد کے لئے ناشتے کی ٹرے اٹھائے آرہی تھی کہ اپنے پیچھے کسی گاڑی کی آواز سن کر اس نے گردن گھمائی۔ ایک لمبی سی چمکیلی بلیو کار حویلی کے گیٹ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ انسانیہ کے قدم غیر ارادی طور پر وہیں رک گئے۔

فواد کی کار تو پچھلے کئی روز سے حویلی کے برآمدے کے پاس ہی کھڑی تھی پھر.... ؟

"شائد فواد کے گھر کا کوئی فرد.... اس کا بھائی یا بہن تی.... ؟؟" انسانیہ نے وہیں کھڑے کھڑے اندازہ لگایا اور آگے چل پڑی۔

فواد کے قریب پہنچ کر اس نے ٹرے ایک بڑے سے چوڑے پتھر پہ رکھ دی۔ اس پتھر سے وہ دونوں میز کا کام لیا کرتے تھے۔

دوسری کار فواد کی کار کے قریب آ کر رکی۔ حامد گاڑی لاک کر کے باغ کی طرف بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پیکٹ اور فائل تھی اور بائیں ہاتھ میں کھانے کی چیزوں والا بیگ۔

خوشی و مسرت اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی اور وہ بے حد جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ آس پاس کی کسی چیز پر دھیان دیئے بغیر وہ فواد کو ڈھونڈتا اور آوازیں دیتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔

جواب میں النسائیہ کی آواز سن کر وہ باغ کے اس حصے میں آنکلا جہاں فواد ایک درخت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ بے خوابی، بے آرامی اور ذہنی انتشار کے باعث سوجی سوجی سرخ آنکھیں۔۔۔ متورم اور کچھ سوچتی ہوئیں۔۔۔۔۔!!

زرد چہرہ۔ بجھا بجھا سا۔

بڑھی ہوئی شیو۔

میلے کچیلے کپڑے اور مضمحل انداز۔!!

الجھے الجھے گرد آلود بال پیشانی اور چہرے پر جھک آئے تھے اور ہاتھ میں سلگتا ہوا سگرٹ تقریباً انگلیوں کو چھو رہا تھا۔

اس کے قریب ہی پتھر پر بیٹھی ، کپ میں فواد کے لئے چائے بناتی ہوئی النسائیہ کو نظر انداز کر کے حامد آگے بڑھا اور ایک والہانہ انداز کے ساتھ فواد سے لپٹ گیا۔

"اوہ۔۔۔ بھیا۔۔۔!" وہ ہنستا ہی چلا جا رہا تھا۔ مانو کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ "بھائی جون۔۔۔۔!" اس نے فواد کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسکی آنکھوں میں جھانکا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ فواد حیران سا۔۔۔ پھٹی پھٹی وحشت زدہ نگاہوں کے ساتھ حامد کیطرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ اس کی گرفت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بھائی جان۔۔۔۔ ! خوب رہی۔۔۔ خدا کی قسم مزا آگیا۔!" اس نے فواد کو اپنی

گرفت سے آزاد تو کر دیا لیکن اس پر پڑا ہوا ہنسی کا دَورہ کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج فواد کے ساتھ حامد بھی اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔

"کیا بات ہے حامد۔۔؟" فواد نے بھاری آواز میں گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "گھر سے کوئی خبر لائے ہو۔۔؟؟"

"کوئی نہر سی خبر۔۔۔۔؟؟؟ بھائی جان۔۔۔! سنیں گے تو اچھل پڑیں گے۔ پڑھیں گے تو نشہ آ جائے گا۔۔۔۔ یہ دیکھئے۔!" اس نے فائل کھول کر ایک انگریزی اخبار نکالا اور فواد کے سامنے گھاس پر پھیلا دیا۔ "لیجئے یہ ہے آپ کی مغیرہ گل کی روح کی حقیقت۔۔۔۔۔!!" ہنسی کا ایک اور فوارہ چھوٹ پڑا۔

"کیا بکتے ہو۔۔؟؟"

"سچ بھیا۔! یہ سب کچھ سنتے ہی ماں جی سجدے میں گر پڑیں اور سیمیں نے تو جھٹ سے ایک پوری دیگ کے پیسے یتیم خانے میں بھجوا دیئے اور بھابی۔۔۔۔!" جانے وہ کیا کیا کہے چلا جا رہا تھا۔ فواد نے اس کی باتوں پر توجہ دیئے بغیر بے اعتنائی سے اچٹتی ہوئی ایک نظر اخبار پر ڈالی اور۔۔۔۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تعجب، تجسس۔!!

"اوہ۔!!"

اخبار کے پہلے صفحے پر ایک لمبے چوڑے فیچر کے ساتھ رنگین و خوبصورت تصویریں بھی تھیں۔ فواد اور مغیرہ گل کی تصویریں۔!

باغ میں۔ جھیل کے کنارے۔ حویلی کے برآمدوں اور کمروں میں گھومتے ہوئے۔ مغیرہ کی قبر پر پھول چڑھاتے اور دیپ جلاتے ہوئے۔ رنگین تصویریں۔ بلیک اینڈ وائٹ

تصویریں۔ ان کے زمانۂ طالب علمی کی اور پھر النسانیہ اور پردل خان کی تصویریں۔!!
ایک اور تصویر بھی تھی۔ رنگین۔ اس تصویر میں پردل خان تھا ایک غیر ملکی سفید فام عورت کے ساتھ۔! گود میں ایک چھوٹی سی بچی لئے ہوئے۔ نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی پلاسٹک کی گڑیا ایسی گلابی سی۔!!
حویلی کی تصاویر بھی تھیں اور النسانیہ کی جھونپڑی کی بھی۔! مختلف زاویوں سے لی ہوئی۔!!
فیچر کے آغاز میں ایک نمایاں بوکس کے اندر جلی حروف میں اخبار کے ایڈیٹر کی طرف سے یہ نوٹ درج تھا۔

"یہ دلچسپ فوٹو فیچر ان عجیب و غریب اور حیرت انگیز حالات و واقعات پر مشتمل ہے جو ہمارے اخبار کی لیڈی ایڈیٹر مس کرسٹا پردل خان کو پاکستان کی سیاحت کے دوران پیش آئے۔
فیچر کی مصنفہ مس کرسٹا اس داستان کی ہیروئن مغیرہ گل کی سوتیلی بہن ہیں اور مغیرہ کے ساتھ اپنی زبردست مشابہت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خود بھی اس دلچسپ داستان کا ایک اہم کردار رہی ہیں۔ ان کا یہ فیچر حسن و عشق کی ایک خوبصورت اور رنگین کہانی ہونیکے ساتھ ساتھ اہل مشرق کی تہذیب و تمدن، رسوم و روایات اور ان قدامت پسند نظریات کی عکاسی بھی کرتا ہے جن کی وجہ سے اس معاشرے میں آئے دن اس طرح کے المناک واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔"

فواد نے یہ نوٹ پڑھا۔۔۔۔ اور اس کے بعد تمام کا تمام فیچر بھی۔۔۔ جلدی جلدی۔۔
۔۔۔ بڑی حیرت اور بے چینی کے ساتھ۔!!
ابھی وہ تجسس و تعجب کے اس بھنور سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ خوشی سے پاگل حامد نے

جیبیں ٹٹول کر ایک لفافہ نکالا۔ نیلے رنگ کا۔ !

"لیجئے بھائی جان میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اس اخبار کے ساتھ یہ خط بھی تھا آپ کے نام۔ میں نے کھولا نہیں۔!"

فواد نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے پر جرمنی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔

"ڈیئر فواد۔!

میرے سفرنامے اور اخبار کے فیچر کے لئے اتنا دلچسپ مواد مہیا کرنے کا شکریہ۔!!

خدا آپ کو صبر و سکون عطا کرے۔ آمین۔!!

مغیرہ گل کی روح کے روپ میں آپ کے ساتھ گذارے ہوئے دن واقعی یادگار تھے اور مجھے.... یہ اعتراف کرنے میں قطعاً باک نہیں کہ ان حسین و خوشگوار دنوں کی خوبصورت یادوں کو بھول جانا کسی بھی حساس اور مخلص انسان کے لئے بے حد مشکل ہے... بلکہ ناممکن۔!!

بہر حال.... مجھے افسوس ہے کہ اپنے اخبار کی طرف سے اچانک ٹیلیگرام ملنے پر مجھے وطن واپس آنا پڑا اور یوں اس دلچسپ کھیل کا خاتمہ ہو گیا جس کے لئے مجھے اپنے اخبار کی انتظامیہ سے اپنے قیام پاکستان کی مدت میں توسیع کی کئی بار درخواست کرنی پڑی تھی۔

مسٹر فواد۔! مجھے امید ہے کہ آپ میری اس جسارت کو معاف کر دیں گے۔ آپ جیسے عالی ظرف اور فراخ دل انسان سے توقع تو یہی ہے۔

خط کیساتھ شائع شدہ فیچر کی ایک کاپی بھی بھیج رہی ہوں۔ شائد آپکے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔!!

نیک خواہشات کے ساتھ
کرسٹا پر دل خان،

فواد حیرت زدہ سا بیٹھا تھا۔ گپ چپ۔ کسی مجسمے کیطرح بے حس و حرکت۔ آہستہ آہستہ اس کا ماؤف ذہن کام کرنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے دائرے سے بننے لگے، ور پھر ان دائروں سے ایک دلکش چہرہ نمایاں ہونے لگا۔ کرسٹا پردل خان کا چہرہ۔!! شوخی، شرارت اور زندگی سے بھرپور چہرے پر دو شریر سی نیلی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ روشن ستاروں کی طرح۔!!

وہ دونوں گھوم رہے تھے۔ حویلی کے لمبے چوڑے کمروں میں۔ برآمدوں میں۔۔۔۔ اور باغ کی روشوں پر۔! جھیل کے کنارے وہ چہل قدمی کر رہے تھے۔

بوٹنگ اور باتیں۔

معنی خیز اور بے معنی باتیں۔

ہنسی، مذاق، گپ شپ اور نجانے کیا کیا۔

فضائیں جھوم اٹھیں تھیں۔ ہواؤں میں ایک بے نام سی باس رچی بسی تھی اور فواد کی پژمردہ روح پر چھائے ہوئے غم واندوہ کے بادل چھٹ کر زندگی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ گنگناتے ہوئے آبشار کے کنارے، آخری ملاقات۔ وہ ملاقات جس میں برسوں کی پیاسی روح سکون و سرور کی لہروں سے سیراب ہوئی تھی۔ تڑپتے، سلگتے اور بے چین دل کو قرار کی دولت نصیب ہوئی تھی۔ اس آخری ملاقات کا تصور تو جیسے ذہن کے پردے پر مجسم ہو کر رہ گیا تھا۔ بھلائے نہیں بھولتا تھا۔!! تب اس چہرے کے بالمقابل ایک، اور چہرہ بھی ابھر آیا۔ مغیرہ گل کا چہرہ۔!!

"افوہ۔۔۔! کس غضب کی مشابہت تھی دونوں میں۔" فواد کے لئے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔

وہ دونوں کھڑی تھیں ۔ پہلو بہ پہلو ۔ دوش بدوش ۔ !!
فواد نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ایک عجیب قسم کی اطمینان بخش مسکراہٹ تھی مغیرہ گل کے چہرے پر ۔ بڑا ہی دلکش اور پرسکون تاثر تھا ۔ جیسے وہ بھی خوش اور مطمئن تھی اس حسن اتفاق پر ۔ !!

فواد کے بھنچے ہوئے لب دھیرے دھیرے پھیلنے لگے اور پھر ..... ایک زندگی بخش تبسم اس کے خشک ہونٹوں پر نمودار ہوا ۔ ایک دلی سکون اور روحانی سرور کی زبردست لہر نے اسکے پورے وجود کو اپنے اندر جذب کر لیا ۔ تاریکیاں چھٹ رہی تھیں ۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی تھی ۔ رنگ بکھر گئے تھے ۔ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل و دماغ کو تازگی بخشنے والے دلکش رنگ ۔

ایک دم سے ہی یہ ... خشک اور بنجر کائنات رنگ و نور اور شعر و نغمہ میں ڈوبی نظر آنے لگی تھی ۔ ایک کرسٹا کے جیتے جاگتے وجود نے زندگی کے خاکے میں جیسے نئے نئے رنگ بھر دیئے تھے ۔ اس میں روح پھونک دی تھی ۔ !!

خوابوں اور خیالوں کی الف لیلائی دنیا تھی ۔ جہاں وہ تھا اور کرسٹا ۔ کرسٹا اور وہ ....!! خواب حقیقت کا روپ دھار رہے تھے ۔

"بھائی جان ۔ ! اب واپس آجائیے ۔" حامد کے لبوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ مچل اٹھی ۔ "کھیل ختم ہو چکا ۔"

"حامد ۔ ! میرے بھائی ۔ ! کھیل ختم نہیں اب شروع ہوا ہے ۔ میں جرمنی جاؤں گا ۔ کرسٹا کو لینے کے لئے ۔ !"

"ہم دونوں جائیں گے کرسٹا بھابی کے پاس ۔" اس نے فواد کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا ۔

فواد نے بھائی کو گلے لگالیا۔ کس قدر مبارک خبر لایا تھا وہ۔

"بھیا۔! اب گھر چلئے۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ گھر میں ماں جی اور سب لوگ آپکے منتظر ہیں۔!"

"چلو۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹ کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ انسانیہ کیطرف متوجہ ہوا۔

"ماں گھبرانا نہیں، میں جلد آؤں گا۔"

"بیٹے۔! کیا وہ... آجائے گی۔؟ میری بیٹی... کرسٹا۔؟؟" انسانیہ کا سوال سن کر فواد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"کیا آپ سچ مچ یہ چاہتی ہیں کہ وہ یہاں آجائے۔ ہمیشہ کے لئے۔؟" وہ انسانیہ کا دل ٹٹول رہا تھا "آپ اسے مغیرہ گل کا مقام دے سکیں گی۔؟؟" وہ مسکرایا۔

"کیوں نہیں بیٹے۔ وہ پر دل خان کی بیٹی ہے۔ مغیرہ کی بہن۔ اس قبیلے کی عزت۔ میری میم بیٹی۔!" انسانیہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ جانے کیوں۔!

"تو ماں، پھر فکر نہ کرو۔ اسے یہاں آنا پڑے گا۔ میری خاطر۔ آپ کے لئے۔! میں اسے ہر قیمت پر لے کر آؤں گا۔ یہ حویلی پھر سے آباد ہوگی۔ آپ یہاں رہیں گی۔ ہماری ماں بن کر۔ اس حویلی کی مالک بن کر۔!! میں بہت جلد آنے کی کوشش کروں گا، آپ کی بیٹی کو ساتھ لے کر۔! اچھا خدا حافظ ماں۔!! گھبرانا نہیں۔"

"اللہ کی امان میرے بچے۔!"

چند ہفتے گذر گئے۔

گڑھی درآدم خان کے لوگ بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ آسیب زدہ حویلی کے کھنڈرات کی نئے سرے سے تعمیر و مرمت کا کام بڑی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ مزدوروں اور معماروں کی کئی ٹولیاں صبح سے شام تک مصروف کار رہتیں۔ علاقے میں پھیلی ہوئی افواہوں سے بے نیاز اور اہل گڑھی کے طرز عمل سے بے پروا۔!

یہ سب مزدور شہر سے آئے تھے۔ حویلی کی تعمیر و مرمت کی نگرانی کے فرائض فواد کے تیسرے بھائی عاصم کے سپرد تھے کہ وہ ایک کامیاب انجنیئر بھی تھا۔ سارا سارا دن وہ مزدوروں اور معماروں کے سر پر کھڑا انہیں ہدایات دیتا رہتا تھا۔

گڑھی درآدم خان کے باشندے ان سرپھروں کا عزم و ہمت دیکھ کر خوفزدہ تھے اور بہت جلد ان پر کسی آفت ناگہانی کے ٹوٹنے کے منتظر۔۔!

ہر آن، ہر گھڑی وہ کسی خوفناک حادثے کے انتظار میں حویلی سے ایک مناسب فاصلے پر گھوما کرتے تھے۔۔۔۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے اور حویلی میں کام کرنے والوں کی عقل کا ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی سمجھ کے مطابق ان کے انجام کی پیشین گوئیاں بھی کیا کرتے تھے۔

کافی دن اسی انتظار، کشمکش اور امید و بیم کے عالم میں گزر گئے اور جب ان کی توقعات اور خدشات کے مطابق کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ پیش نہ آیا تو آہستہ آہستہ ان کا خوف بھی دور ہونے لگا۔ وہ حویلی کے قریب آنے لگے۔ پہلے پہل ڈرتے اور جھجکتے ہوئے۔!! فاصلہ کم ہوا۔

اور جب چند دن میں مزدوروں اور منتظمین سے بات چیت اور بے تکلفی ہوئی تو رہے سہے فاصلے اور شکوک بھی دور ہو گئے۔

اب وہ مزدوروں کا ہاتھ بٹانے لگے ..... ان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے اور یوں گڑھی کے بہت سے بیکار نوجوانوں کو بھی کام مل گیا۔ ایک اچھا خاصا ذریعہ آمدنی خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جی جان سے کام کر رہے تھے۔

مردوں کی دیکھا دیکھی عورتیں بھی حویلی میں آنے جانے لگیں۔ انسانیہ کو خوش و خرم، کام میں مگن اور ہر چیز میں دلچسپی لیتے ہوئے دیکھ کر وہ خوش تھیں اور حیران بھی۔ اگر گڑھی کے عمر رسیدہ لوگ بھی مطمئن ہو گئے کہ حویلی کی اصلی مالکہ انسانیہ اب بالکل تندرست تھی اور جھیل کے کنارے والی جھونپڑی کو خیر باد کہہ کر اپنے آبائی گھر کے ایک نو تعمیر شدہ آراستہ پیراستہ کمرے میں بہت اچھی طرح سے رہ رہی تھی۔ اس کی خدمت کے لئے ایک خادمہ رکھ دی گئی تھی جو اس کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔

حویلی کی تعمیر اور مرمت کے علاوہ باغات سے جھاڑ جھنکاڑ کاٹا جا رہا تھا۔ نئی روشیں، نئے قطعات اور نئے لان بن رہے تھے۔ باغات کے پھلوں، پھولوں اور پودوں کی آبیاری تراش خراش اور مناسب دیکھ بھال کی جا رہی تھی اور شہر کی بہترین نرسریوں سے نئی اقسام کے پودے اور درخت بھی منگوا کر لگوائے جا رہے تھے۔

حویلی کی تزئین و آرائش کے لئے بھاری مخملیں پردے، ماڈرن وضع کا فرنیچر اور بہت سا دوسرا سامان آرائش بھی دھڑا دھڑ آ رہا تھا۔

فواد کی عدم موجودگی میں اس کے بھائی اور خاندان کے دوسرے افراد ان سارے کاموں میں اپنی بساط بھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ہر کام اور ہر چیز میں فواد کی پسند اور ذوق کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ اس کی آمد سے قبل وہ اس لمبے چوڑے کام کو مکمل کر دینا چاہتے تھے۔

انسانیہ یہ سب دیکھ کر جامے میں پھولی نہ سمارہی تھی۔ برسوں اس بے رحم زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اسے اس کا کھویا ہوا مقام پھر سے مل گیا تھا۔

اسکی پر وقار شخصیت اور تحکمانہ انداز اس بات کے شاہد تھے کہ وہ اپنی اہمیت سے آگاہ ہے اور اپنے مقام سے باخبر۔!

فواد کے گھر کے سارے افراد انسانیہ کی خدمت اور دلجوئی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ وہ بھی ان میں خوب گھل مل گئی تھی اور ان کے گھر کی ایک قابل احترام بزرگ بن کر انکے ہر اہم معاملے میں مشیر و مددگار۔!

وہ فواد کے خاندانی معاملات میں گہری دلچسپی اور حویلی کی تعمیر و آرائش میں غیر معمولی انہماک دکھارہی تھی۔

انسانیہ اور فواد کی ماں میں گہری دوستی ہو چکی تھی۔ انسانیہ فواد کے بھائی یا کسی اور فیملی ممبر کی کار میں کئی مرتبہ شہر میں فواد کی ماں کے پاس ہو آئی تھی۔ فواد کی ماں بھی کسی نہ کسی کے ساتھ حویلی میں آجایا کرتی تھی اور دونوں سمدھنیں سر جوڑے بیٹھی اکثر کرشتا اور فواد کی شادی کے پروگرام بنایا کرتی تھیں۔!!

چوبیسواں باب

آج اتوار تھا اور موسم قدرے غبار آلود ـــ !!

چھٹی کے دن سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے حامد آج دیر تک سوتا رہا اور جب جاگا تو کافی دن نکل آیا تھا ـ

بھوک نہ ہونے کی وجہ سے رات کا کھانا بھی حامد نے کچھ یونہی سا کھایا تھا ـ اس وقت جاگا تو بھوک بڑے زوروں پر تھی ـ اس نے اپنی بیگم روحی کو آواز دی تو نوکر نے آکر بتایا کہ چھوٹی بیگم اور سیمیں بی بی فواد میاں کی شادی کی خرید و فروخت کے سلسلے میں بازار جا چکی ہیں ـ

روحی اور سیمیں کے اعلیٰ ٹیسٹ اور عمدہ انتخاب کے پیش نظر دلہن کے لئے زیورات اور شاندار عروسی جوڑے کی خریداری کا اہم کام ماں جی نے ان دونوں کے سپرد کر رکھا تھا ـ چند روز قبل کافی دکانیں گھومنے اور خاصی چھان پھٹک کرنے کے بعد انہوں نے زیورات کے بہترین نمونے منتخب کر کے دکاندار کو آرڈر دیدیا تھا ـ عروسی جوڑے کے لئے سُرخ کمخواب کا غرارہ سیٹ اور لشو کا دوپٹہ خرید کر دوپٹے پر کام کرنے کے لئے دیدیا گیا تھا ـ بہترین قسم کے سوٹ اور ساڑھیاں بھی سلمے ستارے کے نفیس اور بھاری کام کے لئے دیدی گئی تھیں ـ دکانداروں نے آج چیزیں لوٹانے کا وعدہ کیا ہوا تھا اور ماں جی صبح ہوتے ہی تقاضا کرنے بیٹھ گئی تھیں ـ ان کے سب سے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کی شادی تھی نا ـ کتنے ارمانوں اور دعاؤں کے بعد یہ وقت آیا تھا ـ ماں جی دل کھول کر اپنے ارمان نکالنا

چاہ رہی تھیں۔
حامد نے نوکر کو ناشتہ لانے کے لئے کہا اور خود غسلخانے میں گھس گیا۔ فارغ ہو کر آیا تو نوکر میز پر ناشتہ لگا چکا تھا۔ حامد نے ناشتہ کیا اور برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔
اس کی نظریں ایک خبر کی سرخی پر آکر ٹک گئیں۔ فلسطینی فدائیوں نے آج پھر ایک مسافر بردار طیارہ اغوا کر لیا تھا اور اس کے مسافر بطور یرغمال پکڑ لئے گئے تھے۔ حامد نے سرخی دیکھی۔ بے پروائی کے ساتھ... جیسے عام خبریں۔!!
گذشتہ چند ماہ سے ایسے واقعات کئی مرتبہ ہو چکے تھے۔ فلسطینی حریت پسندوں نے کئی ایئر لائینز اور اسرائیل کے مسافر بردار طیارے اغوا کر کے مختلف ممالک کی ایئر پورٹس پر اتار لئے تھے۔
ایسے واقعات کی کثرت کے پیش نظر حامد کو اس خبر میں کوئی جدت نظر نہ آئی تاہم وہ خبر پڑھنے لگا اور مسافروں کے نام بھی۔!
ایک نام..... کے ساتھ ہی جیسے اسے بچھو نے ڈنگ مار دیا..... آنکھوں کے سامنے ہر چیز ناچنے لگی۔ وہ بدحواس سا ہو کر آنکھیں مل مل کر بار بار یہ نام پڑھ رہا تھا۔ فواد مسعود اور کرسٹا پر دل خان۔!!
"اوہ.....! یہ نہیں ہو سکتا۔! بھلا یہ کیسے ممکن ہے.....؟؟" وہ اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔
اغوا شدہ طیارے میں بظاہر کوئی پاکستانی قومیت رکھنے والا مسافر سوار نہ تھا..... لیکن اس کا کیا علاج کہ فواد جو گذشتہ کئی سالوں سے امریکی شہریت اختیار کر کے اپنے کاروبار کو امریکہ کی مختلف ریاستوں میں پھیلا چکا تھا امریکی پاسپورٹ پر ہی سفر کر رہا تھا۔ وہ مغربی جرمنی سے

کرسٹا کو ساتھ لیکر چند روز کے لئے امریکہ جا رہا تھا۔ اپنے کاروبار کا جائزہ لینے کے لئے۔ کہ طویل غیر حاضری کی وجہ سے اسکے انتظار میں بہت سے کام رکے پڑے تھے۔!!

پچھلے کئی ہفتوں سے اس کے منیجر کے خط اور ٹیلیفون آرہے تھے۔ بہت سے حل طلب امور کے لئے اسے فواد کی رہنمائی اور تجاویز کی ضرورت تھی اس لئے فواد نے سوچا کہ سیدھا پاکستان واپس آنے کی بجائے کرسٹا کے ساتھ ایک ڈیڑھ ہفتے کے لئے امریکہ بھی ہو آئے اور اب راستے میں۔۔۔۔۔۔!!

حامد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ماں جی کو یہ خبر کس طرح سنائے۔ عمر رسیدہ اور اکثر بیمار رہنے والی ماں جو صرف فواد کے سر پر سہرا دیکھنے اور اس کے بچے کو لوری سنانے کی آرزو میں زندہ تھی۔۔۔۔ اسکی آمد اور شادی کے انتظار میں ایک ایک گھڑی اور ایک ایک پل گن گن کر گذار رہی تھی اور۔۔۔۔ اس وقت بھی ایک ہمسائی کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھی فواد کی برات اور شادی کے پروگرام کی تفصیلات پر صلاح و مشورے میں مشغول تھی۔۔۔۔ وہ ماں یہ نیا حادثہ کیسے برداشت کر سکے گی۔۔۔۔ اگر مارے صدمے کے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تو۔۔۔۔۔؟؟

اور بوڑھی ماں کی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھنے سے بچانے کے لئے حامد نے اس خبر کو چھپا لینا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی اس کا خیال تھا کہ مسافروں کی قید و بند کا یہ سلسلہ زیادہ دن تک نہ چلے گا مختلف حکومتوں سے اپنی چند ایک شرائط منوا کر اور اپنے کچھ گرفتار شدہ ساتھیوں کی رہائی کے بدلے میں حریت پسند اغواہ شدہ طیارے کے مسافروں کو رہا کر دینگے کہ اس سے پہلے بھی کچھ ہوتا آیا تھا۔

فواد نے باقی بھائیوں کو یہ خبر دکھا کر ان کے ساتھ مشورہ کیا تو انہوں نے بھی یہی رائے

دی کہ اس خبر کو خواتین سے پوشیدہ رکھا جائے۔ اخبار کا وہ صفحہ بھی چھپا دیا گیا جس میں
یہ خبر شائع ہوئی تھی۔

ماں جی اور بہنیں صبح و شام فواد اور کرسٹا کی منتظر تھیں۔ باپ بھی ہر روز ہی بیٹوں سے
اس کی آمد کا دن پوچھا کرتا تھا۔ ... مگر ... لاعلمی کا یہ کامیاب مظاہرہ کب تک؟
والدین کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔
آخر ایک ترکیب سوچ لی گئی۔

ماں باپ اور بہنوں کو مطمئن کرنے کے لئے فواد کیطرف سے ایک ٹیلیگرام موصول ہونے
کا اعلان کر دیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ بعض کاروباری مصروفیات کی وجہ سے ابھی وہ
چند روز امریکہ میں ہی ٹھہرے گا۔

ماں اور بہنیں اس خبر سے بدل تو ہوئیں لیکن شادی کی تیاریوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ ادھر
حویلی کی تعمیر و مرمت کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور اب معمار اس کو فائنل ٹچز دے کر
اس کا رنگ و روپ نکھارنے میں مصروف تھے۔ مکمل طور پر تیار ہو جانے والے کمروں
میں ساتھ ساتھ ہی فرنیچر اور دوسرے سامان کی سجاوٹ اور آرائش بھی کی جا رہی تھی۔
دوسری طرف شہر والے اس گھر میں بھی صفائی، سفیدیاں اور رنگ و روغن وغیرہ تقریباً
مکمل ہو چکے تھے اور اب جدید وضع کی یہ کوٹھی کچھ اور ہی شان اور رنگ و روپ لئے
ہوئے نظر آتی تھی۔

دلہن کے زیورات اور کپڑے خرید لئے گئے تھے اور کپڑوں کی سلائی کے لئے اب صرف
دلہن کے ماپ کی ضرورت باقی رہ گئی تھی۔
شلواریں قمیضیں۔

غرارے اور ساریاں۔

کرتے۔ چوڑی دار پاجامے اور فلیپرز۔۔!!

بری میں کرسٹا کے لئے سبھی قسم کے مروجہ لباس بنوائے جا رہے تھے۔ سیمیں اور بیگم حامد کا خیال تھا کہ اس سمارٹ سی.... خوبصورت سی کرسٹا بھابی کے سڈول جسم پر یہ پاکستانی لباس صحیح معنوں میں سجیں گے۔ وہ اسے دلہن بھی پورے مشرقی انداز میں بنانا چاہتی تھیں۔ سمٹی سمٹائی اور شرم وحیا کا پیکر.... نیلی نیلی.... جھکی جھکی آنکھوں والی..... سرخ وسفید گالوں اور... سنہری بالوں والی گڑیا سی کرسٹا بھابی کا تصور ہی سیمیں کو مست کر دیتا۔ وہ اخبار جس میں کرسٹا کا فیچر شائع ہوا تھا سیمیں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور وہ ماں جی کے ساتھ مل کر ہر روز اخبار میں فواد اور کرسٹا کی تصویریں بڑے شوق اور پیار بھری نگاہوں کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ پھر دن ماں جی اور دوسری بھابیوں کے ساتھ اس کی باتیں کیا کرتی تھی اور ماں جی.... وہ بھی تو بہو کو دیکھے بنا ہی اس پر بری طرح فدا ہو چکی تھیں۔

"سیمیں بیٹی۔! وہ اخبار تو لانا.... ذرا اپنی خالہ کو دکھاؤ.... اپنی بھابی کی تصویر۔!"

ہر ہمسائی اور ہر رشتے دار خاتون کی آمد پر ماں جی سیمیں کو اخبار لانے کے لئے دوڑاتیں۔ اور پھر گھنٹوں اپنی "میم بہو" کی ذہانت، خوبصورتی اور عقل مندی و بہادری کے قصے وہ آنیوالیوں کو سنایا کرتی تھیں۔

فواد کے سارے بھائی اغوا شدہ طیارے کے مسافروں سے متعلقہ تفصیلات جاننے کے لئے روزانہ کے اخبارات کا مطالعہ بڑی توجہ اور انہماک سے کیا کرتے تھے۔ ہر روز

مختلف اخباروں سے خبریں پڑھ کر وہ ان پر تبصرے کرتے اور ہر صبح طیارے کے مسافروں کی رہائی کے منتظر رہتے ــ!!

اخباری اطلاعات کے مطابق مسافروں کو معقول جگہوں پر بڑے آرام کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ بظاہر تشویش کی کوئی بات نہ تھی کہ نظر بندی کے علاوہ ان لوگوں کو اور کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ تاخیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یرغمالی مسافروں کے بدلے میں مختلف ممالک میں نظر بند چھاپہ ماروں کو رہا کرانے کے لئے فدائین اور متعلقہ حکومتوں کے درمیان گفت وشنید کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی۔

کئی دن گذر گئے۔

فواد کے تینوں بھائی ہر صبح اخبارات کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے۔ اخبار آتے ہی صفحہ صفحہ بٹ جاتا اور پھر ..... ایک ایک کالم ...... ایک ایک خبر ... اور ایک ایک تفصیل پڑھ ڈالتے۔ اس آس کے ساتھ کہ شائد آج امید کی کوئی کرن نظر آجائے مگر ...!!

اور آج کی خبریں تو بے حد مایوس کن تھیں ..... کیونکہ آج فدائین اور اردن کی شاہی فوجوں کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی تھی۔ اردن کے دارالحکومت عمان کے گلی کوچے بندوقوں، توپوں اور بموں کی گھن گرج سے دہل رہے تھے۔ فدائین شہروں آبادیوں اور بڑی بڑی عمارات کو تباہ و برباد کرنے میں مصروف تھے اور شاہی فوجیں فدائین کے اڈوں اور فلسطینی کیمپ پر گولہ باری میں مشغول ــ!!

بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا اور دشمن کے گھر میں گھی کے چراغ جل رہے تھے۔ اعرابوں کی اس خانہ جنگی نے ان کے مقاصد اور تحریک آزادیٔ فلسطین کو دشمن کے گذشتہ

تمام حملوں اور تمام سازشوں سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔

بڑی طاقتوں کا ہر قدم ان کے اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے تھا۔ دھمکیوں اور بیان بازیوں کا سلسلہ عروج پر تھا اور ادھر... آگ اور دھوئیں کے بادل اس چھوٹی سی مملکت کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔

حریت پسندوں کے بیان کے مطابق اغوا شدہ طیارے کے یرغمالی مسافروں کو عمان کے شہر میں ہی کہیں رکھا گیا تھا مگر کہاں .....؟؟؟

اس سوال کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

متعلقہ ممالک کی تسلی کے لئے حکومت اردن نے اعلان کیا تھا کہ جوں ہی مسافروں کے ٹھکانے کا پتہ چلا حکومت انہیں رہا کر کے ان کے وطن واپس جانے کی اجازت دے دیگی۔

بھائیوں کی آپس میں سرگوشیاں، بجھے بجھے اداس چہرے اور پیشانیوں پر تفکر کی گہری لکیریں ان کی بیویوں سے کب چھپی رہ سکتی تھیں .....؟ وہ یہ سب دیکھ رہی تھیں .....کچھ محسوس کر رہی تھیں ..... ان سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ شریک حیات ہونے کے ناطے سے مگر وہ .... وہ تو ہر مرتبہ طرح دے جاتے..... کنی کترا جاتے تھے

" سب کو پریشان کرنے سے فائدہ ـــ؟ اور پھر عورتیں تو ہمیشہ سے چھوٹے دل کی مالک ہوتی ہیں اور پھر ماں جی .... !"

بہنوں اور بیویوں کے سارے سوالات کا ایک ہی جواب تھا۔ ایک پراسراری خاموشی ! لیکن کب تک ـــ ؟

انہوں نے چھپ چھپ کر خاوندوں کی گفتگو سنی اور یوں بوڑھے والدین کے علاوہ گھر میں سبھی کو پتہ چل گیا۔

ہنستے مسکراتے چہروں پر زردی کھنڈ گئی۔

پریشانی، اداسی، گھٹن اور سینے پر بوجھ —!!

تیاریاں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ انتظار — انتظار . . . اور انتظار —!!!

"جانے بھائی جان کے مقدر میں کیا ہے ۔؟" سیمیں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں عاصمہ آپا کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کو چھپانے کیلئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"شادی کے معاملے میں بھائی جان کچھ ایسی ٹھنڈی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہیں کہ حالات کو سلجھانے کی جتنی کوشش کرو معاملہ الجھتا ہی چلا جاتا ہے ۔" عاصمہ آپا بھی دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگیں ۔

"ابھی دیکھ لو۔ امید کی ایک کرن نظر آئی تھی کہ بیٹھے بٹھائے یہ مصیبت آن پڑی . . . . . شائد کچھ لوگ تقدیر کیطرف سے ہی الجھے ہوئے بندھن لیکر پیدا ہوتے ہیں ۔"

پاس ہی چارپائی پر بیٹھی روحی نے سبزی بناتے بناتے اظہار تأسف کیا۔ "اللہ میاں بھائی جان کو خیریت سے واپس لائے تو میں شکرانے کے سو نفل پڑھوں گی ۔"

یہ سیمیں تھی ۔ فواد کی لاڈلی اور ضدی بہن ۔

"میں پنجتن پاک کے نام پر نیاز کی دیگ دلواؤں گی ۔" عاصمہ آپا نے حسب عادت جھٹ سے منت مان لی ۔

فواد بزدل نہ تھا۔

قید و بند اور قتل و خون ریزی کے ان مشکل ایام میں بھی، دوسرے لوگوں کے برعکس وہ کچھ زیادہ پریشان اور خوفزدہ نہ ہوا۔ اسکی سب سے بڑی وجہ شائد یہ بھی تھی کہ آزمائش کی ان پر آشوب ساعتوں میں بھی کرسٹا اس کے ساتھ تھی۔ کرسٹا جس کے ساتھ چند دن گذار کر ہی فواد اس کے بے حد قریب آچکا تھا۔ دل کی دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب۔۔!!

دونوں ایک ہی منزل کے مسافر تھے اور ایک ہی کشتی کے سوار۔۔!! اور کرسٹا کی رفاقت میں تو وہ ملک الموت سے بھی پنجہ آزمائی کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا سکتا تھا۔ آندھیوں سے لڑ سکتا تھا۔۔۔۔۔ طوفانوں سے کھیل سکتا تھا۔۔!!

کرسٹا۔۔۔ وہ پیاری سی لڑکی۔۔۔ جس کی قربت کا احساس زندگی میں پیش آنے والے ہر دکھ۔۔۔۔ ہر تکلیف، ہر غم اور ہر پریشانی کو راحت میں بدل ڈالنے کی قدرت رکھتا تھا۔

نظر بندی کے ان ایام میں وہ توپوں کی گھن گرج سنتے رہے۔ بموں کے دھماکوں سے ان کے در و دیوار لرزتے رہے اور موت۔۔۔۔ بارہا ان کے دروازوں پر دستک دے کر گذر گئی۔۔۔۔ ایک پرچھائیں کی طرح ان کے قریب آئی۔ دبے پاؤں۔۔۔ اور پھر سمندر کی کسی چنچل لہر کی طرح بل کھاتی ہوئی لوٹ گئی۔ بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ۔۔!!

بم پھٹتے رہے ۔ آگ اور خون کا ہولناک کھیل جاری تھا۔ اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ ۔!!
اور وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح ۔ ۔ ۔ زندگی کی سٹیج پر کھیلا جانے والا یہ خونی ڈرامہ
دیکھتے رہے۔ ایک ایسا خوفناک ڈرامہ ۔ ۔ جس کے تمام کردار حقیقی تھے ۔ جیتے جاگتے
اور زندگی سے بھرپور کردار ۔۔!!

پچیسواں باب

"خدا کا شکر ہے کہ آج موسم بالکل ٹھیک ہے اور فلائٹ اپنے مقررہ وقت پر آرہی ہے۔" ائیر پورٹ پر کھڑی عاصمہ آپا نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہار کے منتشر پھولوں کو ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

"پروردگار۔! میرے بچے کو خیریت سے واپس لا اور ہمیں اسکی خوشیاں دیکھنی نصیب کر۔!" ماں کے دل کی گہرائیوں سے بے ساختہ دعا نکلی۔

"حامد بھیا۔! پنک گلاب کا یہ ہار کرسٹا بھابی کے لئے ہے۔ اور یہ والا سُرخ فواد بھائی کے واسطے۔ ٹھیک ہے نا۔؟" سیمیں نے بچگانہ انداز میں حامد سے مشورہ کیا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" حامد نے سگرٹ لائٹر نکال کر سگریٹ سلگایا۔

"جہاز ٹھیک ٹائم پر آرہا ہے۔" آصف نے آکر اطلاع دی۔ وہ انکوائری آفس سے پوچھنے کے لئے گیا ہوا تھا۔

رہائی کے بعد آج فواد وطن واپس آرہا تھا۔ کرسٹا کو ساتھ لے کر۔!! رات اس کا ٹیلیگرام ملا تھا اور اس وقت گھر کے تقریباً سارے افراد ان کے خیر مقدم کے لئے ائیر پورٹ پر آئے ہوئے تھے۔

"جہاز کے آنے میں کتنی دیر ہے بیٹا۔؟" ماں جی سے صبر کہاں ہو سکتا تھا۔ وہ باری باری سب سے پوچھ رہی تھیں۔ "تمہاری گھڑی پر کیا بجا ہے۔؟ ابھی جہاز آنے میں

کتنا وقت اور لگے لگا۔؟؟"

"بس آنے ہی والا ہے ماں جی۔" روحی نے انہیں تسلی دی۔" اس طرح کھڑے کھڑے تو آپ تھک گئی ہونگیں۔۔؟ بہتر ہوتا کہ آپ لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھتیں۔ ہم فواد بھائی اور کرسٹا کو لے کر آپ کے پاس آجاتے۔"

"ہنہ ہو میں نہیں تھکی ہاں فواد کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں ضرور تھک گئی ہیں۔ ہا... ہا" انھوں نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیا۔ خدا خیریت کے ساتھ لائے میرے پردیسی بیٹے کو۔!" ماں کے ہر ہر سانس سے دعائیں نکل رہی تھیں۔

"ماں جی۔! آپ سے کہا بھی تھا کہ آپ گھر پر ہی ٹھہریں پر آپ سنتی کب ہیں۔ اب دیکھئے آپ سے کھڑا تو ہوا جاتا نہیں۔" آصف نے دیکھا کہ ریلنگ کا سہارا لئے کھڑی بوڑھی ماں کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ حامد نے قریبی پلاٹ میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے لوہے کی ایک کرسی گھسیٹ کر ماں جی کو بٹھا دیا۔

جہاز کی مخصوص گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی منتظر نگاہیں آسمان کیطرف اٹھ گئیں۔

ایئرپورٹ پر چند چکر کاٹ کر جہاز نے لینڈ کیا اور ایئرپورٹ پر موجود لوگوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

جہاز کو سیڑھی لگائی گئی۔ سب سے پہلے ایک سمارٹ سی ایئر ہوسٹس مسکراتی ہوئی برآمد ہوئی اور اس کے پیچھے پیچھے باقی مسافر بھی اترنے لگے۔

فواد کے ساتھ کرسٹا اور اس سے ایک قدم پیچھے کرسٹا کی ماں ویرا۔!!

ماں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بیٹے کے انتظار میں کرسی چھوڑ کر جانے وہ کب ریلنگ

کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

حامد، آصف، اور سیمیں مارے خوشی کے جنگلے سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

"بھائی جان۔! میرے بھیا۔!" دونوں بیک وقت فواد سے لپٹ گئے۔

سیمیں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک آنسوؤں میں ڈھل گئی تھی۔ فواد نے کھینچ کر اسکا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

فواد کو سیمیں کی طرف متوجہ چھوڑ کر حامد اور آصف کرسٹا اور اسکی ماں ویرا کیطرف بڑھے اور پاکستان میں انہیں خوش آمدید کہہ کر سفر خیریت کے ساتھ کٹنے کا حال پوچھا۔

"بھابی۔!" سیمیں فواد سے فارغ ہو کر کرسٹا کے گلے میں جھول گئی۔ وہ ہمیشہ کی شوخ، شریر اور چنچل تھی۔ موقع و محل کی مصلحتیں اس کے نزدیک بے معنی سی بات تھی۔ کرسٹا کو اس کی اس حرکت پر کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ فواد غائبانہ طور پر اسے اپنے تمام فیملی ممبرز سے متعارف کرا چکا تھا۔ وہ سب کی عادات کے متعلق تھوڑا بہت جان گئی تھی۔ خاص طور پر سیمیں کے متعلق۔!

جنگلے کے پار آکر وہ ماں سے ملے۔ پھر باپ کی باری آئی اور پھر اہلِ خاندان کی۔

عاصمہ آپا اور روحی نے کرسٹا کی ماں اور کرسٹا کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

کرسٹا کو عاصمہ آپا اور سیمیں نے سرخ گلاب کے ہار پہنائے اور ویرا کو رنگارنگ پھولوں کے ہار پہنانے کا فرض ماں جی نے سر انجام دیا۔ یوں بھی وہ ان کی سمدھن تھی نا۔!

کرسٹا اور اس کی ماں کو فواد کے تمام گھر والے اور ان کی طرف سے پر جوش استقبال کا یہ خلوص بھرا مشرقی انداز بے حد بھایا۔ بات بات پر وہ "تھینک یو۔ تھینک یو" کی گردان کرتے نہ تھکتی تھیں۔

وہ گھر آئے۔

شادی کی مصروفیات اور ضروری امور کی انجام دہی میں تین چار روز اتنی تیزی سے گذر گئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چل سکا ...... مگر کرسٹا کی ماں ویرا کے لئے یہ چار دن چار صدیوں سے کم نہ تھے۔ وہ اڑ کر گڑھی ور آدم خان میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس عظیم الشان قلعہ نما حویلی میں جہاں کے چپے چپے پر اس کے روایات کے غلام ... اور بے وفا" شوہر پردل خان کے نقوش پا ثبت تھے ...... گوشے گوشے میں اس محبوب ہستی کی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ اس ہستی کی جس کے بعد ویرا جیسی آزاد خیال مغربی خاتون نے بھی کسی دوسرے مرد کے قریب جانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ شادی کے بعد مختصر سی ازدواجی زندگی میں پردل خان نے اسے وہ خلوص، وہ پیار اپنائیت اور رفاقت کے وہ ناقابلِ فراموش لمحات دیئے تھے کہ پردل خان کے بعد ... ویرا کے نزدیک کوئی مرد اس معیار پر پورا نہ اتر سکتا تھا۔ اس سے علیحدگی کے باوجود ویرا نے ... ان حسین و خوشگوار یادوں کے سہارے ساری زندگی گذار دی تھی اور آج وہ .... ان مقامات، ان جگہوں ..... اور اس حویلی کو دیکھنے کے لئے بے چین تھی جو اس کے مرحوم شوہر کی شان و شوکت، عزت و عظمت اور خاندانی وقار کی امین تھی۔

کرسٹا نے پہروں ماں کے سامنے بیٹھ کر .... اس کے قریب لیٹ کر اسے یہاں کے سارے واقعات کی تفصیلات سنائی تھیں اور ... ویرا کے لئے یہ داستانیں کسی الف لیلائی ماحول کی طلسمی کہانیوں سے کم نہ تھیں۔ وہ گھنٹوں ان کہانیوں کے سحر میں کھوئی رہتی۔ بیٹی سے ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھا کرتی۔! اور اسکی بیان کردہ تفصیلات کو انتہائی شوق، توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا کرتی۔!

کرسٹا... جو خود بھی ان دلکش و دلفریب مقامات کے شکوہ و عظمت سے بری طرح متاثر تھی ماں کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں اس علاقے، ماحول، وہاں کے لوگوں اور حویلی کے متعلق باتوں پر باتیں کئے جاتی۔ ایک ایک چیز اور ایک ایک بات کی جزئیات تک بیان کرتی... ان رومان پرور و دل آویز مناظر کی تصویریں کچھ اس انداز سے کھینچتی کہ اس کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ویرا خود کو اس ماحول میں چلتے پھرتے اور اسی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔

کرسٹا نے ماں کو اس جگہ کی لاتعداد فوٹوز دکھائی تھیں۔ کلرڈ بھی اور بلیک اینڈ وائٹ بھی۔!!

کرسٹا پیدائشی شاعرہ تھی اور ایک بڑے اخبار کی لیڈی ایڈیٹر۔! اس سحر آلود اور رومینٹک ماحول پر کہی ہوئی اس کی خوبصورت نظمیں جرمنی کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپ کر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ ویرا کرسٹا کی ماں... خوابوں اور خیالوں کی اس رومان پرور اور شاعرانہ فضا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کیلئے بے چین تھی.....! وہ انسانیہ سے بھی ملنے کی خواہشمند تھی... انسانیہ جو اسکے شوہر کی پہلی بیوی تھی... اور اس کے شوہر کی رشتے کی بہن.... اس کی عزت و عظمت کی امین... قبیلے کا وقار... اس حویلی کی مالکہ اور... مغیرہ گل کی ماں۔

وہ مغیرہ گل جو کرسٹا سے حیرت انگیز حد تک مشابہت و مماثلت رکھتی تھی۔ ایسی زبردست مشابہت کہ خود مغیرہ گل کی ماں اور فواد بھی دھوکا کھا گئے تھے۔

حامد، آصف اور فواد کی کاریں حویلی کے برآمدے کے ساتھ آن کر رکیں۔ انسانیہ کو ان کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ فواد کے بھائی عاصم اور چند ملازمین کے ہمراہ برآمدے میں ان کے استقبال کو موجود تھی۔

کرسٹا پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور سب کو بھول کر اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ ”میری بیٹی۔! میری کرسٹا۔۔۔ میری مغیرہ گل۔!“ وہ دیوانہ وار اسکی پیشانی، بال، آنکھیں اور رخسار چوم رہی تھی اور اسکی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

”امی۔! ماں۔!“ کرسٹا نے کسی معصوم بچی کی طرح اسکے سینے میں منہ چھپا لیا۔

انسانیہ کے ترسے ہوئے کانوں کے لئے یہ مختصر سے الفاظ کسی مسحورکن نغمے سے کم نہ تھے۔ آج۔۔۔ ایک عمر گذرنے کے بعد اس نے سکون و اطمینان کی ایک عجیب سی توانائی آمیز لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔

کرسٹا سے علیحدہ ہو کر وہ باقی لوگوں کیطرف متوجہ ہوئی۔ سبھی چہرے جانے پہچانے تھے مگر۔۔۔۔۔!

اس کی نگاہیں پنجابی طرز کی شلوار، کرتے اور دوپٹے میں ملبوس کٹے ہوئے بالوں والی ایک ادھیڑ عمر یورپین خاتون پر آ کر ٹھک گئیں۔ کرسٹا کے ساتھ اس کی ماں کی آمد انسانیہ سے دانستہ چھپائی گئی تھی۔

”آپ۔۔۔۔ آپ۔۔۔؟؟؟“ استفہامیہ نگاہوں کے ساتھ اس نے اس سنجیدہ سی خاتون کے سراپا کا جائزہ لیا۔

”خالہ جان۔! آپ کو معلوم نہیں۔؟ یہ کرسٹا بھابی کی امی ہیں۔ جرمنی سے ان کیساتھ ہی آئی ہیں۔“ کسی اور کو موقع دیئے بغیر سیمیں جھٹ سے بول اٹھی۔

انسانیہ اور ویرا نے گہری گہری نگاہوں کے ساتھ ایک دوسری کو دیکھا اور دونوں نے سینے میں ایک بے نام سی چبھن اور خلش محسوس کی۔

انسانیہ اور پردل خان ۔

پردل خان اور ویرا ۔!!

انسانیہ کے دل سے ایک دھواں سا اٹھا جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ ! چند ثانیے کے لئے ماحول پر ایک بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے کچھ کہنا چاہا پر۔۔۔ پردل خان کا وجود ایک دیوار بن کر درمیان میں حائل ہو گیا تھا۔

پردل خان کی شخصیت دو حصّوں میں بٹ چکی تھی ۔

انسانیہ اس کی پہلی بیوی تھی ۔ ایسی وفاشعار بیوی۔۔۔۔ جس نے ہر دکھ اور ہر تکلیف اٹھا کر بھی مرتے دم تک اس کا ساتھ دیا تھا۔ ایک گرہستی مشرقی عورت کیطرح ۔!! اور ویرا۔۔۔ پردل خان کا اپنا انتخاب ۔! اس کی محبوبہ۔۔۔۔۔ اس کی شریک حیات ۔۔۔۔ جس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ذہنی وجذباتی ہم آہنگی اور حقیقی سکون کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ! ویرا جس کی رفاقت میں پردل خان کی پژمردہ روح سے بھی خوشی کے وہ لازوال چشمے پھوٹے تھے جن سے اس کی تھکی تھکی روح زندگی کے آخری سانس تک قوت نمو حاصل کرتی رہی تھی ۔

حالات نے۔۔۔ روایات کی زنجیروں نے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ مگر کیا۔۔۔ وہ اسے اپنے دل سے نکالنے میں کامیاب ہوا ۔ ؟ نہیں ۔ ! زندگی کے آخری سانس تک وہ اسے پکارتا رہا ۔ اپنی خاموش تنہائیوں میں ۔۔۔ اسے اپنے قریب

محسوس کرتا رہا۔ ۔ ۔ اور پھر کتنے ہی ایسے دن بھی آئے جب وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوا۔ ۔ ۔ تصور ہی تصور میں ویرا سے اپنی زیادتی کی معافی مانگتا اور اس کے سامنے اظہار ندامت کرتا رہا۔ !!

السانیہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن تھی غضب کی ذہین ۔!!

ایک عورت کی ذکاوت جس سے کام لیکر وہ اپنے شوہر کا ذہن پڑھ چکی تھی۔ اس کے خیالات اور جذبات و احساسات سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس کا سرتاج اس کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتا۔ ۔ اپنی ساری خوش مزاجی زندہ دلی اور خوش اخلاقی بھول کر دن بہ دن اس قدر چڑچڑا، اکھڑ اور سخت گیر کیوں ہوتا جارہا ہے۔ شائد لاشعوری طور پر وہ السانیہ سے مطمئن نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ اسے نظرانداز کر کے وہ اس سے اپنی ذہنی، روحانی اور جذباتی محرومیوں کا انتقام لے رہا تھا۔ اور اسے ان سب باتوں کا ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا۔!!

اور آج۔ ۔ ۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ دونوں حریف۔ ۔ ۔ ۔ دونوں رقیب آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ویرا اور السانیہ۔!!

اگرچہ ذہنی اضطراب، کشمکش اور الجھن دونوں کے چہرے سے نمایاں تھی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن السانیہ کچھ زیادہ ہی نروس اور اپ سیٹ نظر آرہی تھی کہ اس کے لئے یہ دھچکا بالکل اچانک تھا۔ ۔ ۔ جبکہ ویرا ذہنی طور پر اس کے لئے پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔

ٹھیک ہی تو کہتے ہیں یہ بڑے بڑے فلاسفر۔ ۔ ۔ ۔ کہ یہ عورت ذات بھی ایک عجیب معمہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ پیچیدہ اور الجھی ہوئی فطرت کی مالک۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حاسد اور

زر در بخ . . . . جو ایک زمانہ گذر جانے کے باوجود بھی اپنے پیار کی دولت پر ڈاکہ ڈالنے والے وجود کو معاف نہیں کر سکتی ۔!!

فضا پر محیط اس بوجھل خاموشی نے کرسٹا کو موقع کی نزاکت کا احساس دلایا ۔ وہ آگے بڑھی ۔ اس نے دونوں کے چہرے پڑھ لئے تھے نا ۔

"امی . . . . ." اس نے النسانیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ۔ "ممی سے نہیں ملیں گی؟"

کرسٹا کے منہ سے امی کا لفظ تھا کہ نغمہ ۔ النسانیہ چونک پڑی ۔ وہ ماضی کو بھول کر حال کے ناقابل تردید حقائق کا سامنا کرنے کے لئے اس جیتی جاگتی دنیا میں واپس آگئی ۔ اس نے کرسٹا کو بغور دیکھا ۔ مغیرہ گل کا دوسرا روپ ۔!! وہی معصومیت وہی پیار بھرا لہجہ ۔ ممتا پوری طرح بیدار ہو چکی تھی ۔

جانے والا تو برسوں پہلے اس دنیا سے منہ موڑ کر جا چکا تھا . . . . . دونوں سے دور ۔! اب زندگی میں رہ بھی کیا گیا تھا . . . کرسٹا اور صرف کرسٹا . . . . ویرا کی بیٹی ۔ جو مغیرہ گل کی ہو بہو تصویر تھی . . . . پر دل خان کا خون . . . . النسانیہ اور ویرا دونوں کے جینے کا واحد سہارا ۔!!

"بہن ۔!" سب کچھ بھول کر النسانیہ نے بازو پھیلا دیئے ۔

ویرا ایک سیکنڈ کے لئے رکی . . . . جھجکی . . . اور پھر النسانیہ سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی ۔ دونوں رو رہی تھیں ۔

ان کے یہ آنسو دل کی کونسی ملی جلی کیفیات کے ترجمان تھے کوئی بھی توصیح اندازہ نہ لگا سکتا تھا ۔

دل کے آئینے پر برسوں کا جما ہوا گرد و غبار خلوص کے آنسوؤں نے دھو ڈالا تھا ۔

حسد، بغض، نفرت، کینہ اور رقابت کا ہر کثیف جذبہ ان مقدس آنسوؤں میں بہ گیا تھا اور اب فضا صاف ہو چکی تھی۔ دھل دھلا کر نکھری نکھری۔ روشن روشن اور اجلی اجلی سی نظر آ رہی تھی۔!!

تھوڑی دیر بعد وہ سب حویلی کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے چائے کی چسکیوں کے درمیان کرسٹا اور فواد کی شادی کی تفصیلات طے کرنے میں مصروف تھے۔!

انسانیہ اپنی مادری زبان کی بجائے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر رہی تھی اور ویرا انگریزی میں۔ سیمیں دونوں کے درمیان بیٹھی ترجمان کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

"کرسٹا اور فواد کہاں ہیں۔؟" ماں جی نے شال اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

"باغ میں۔ ابھی میں نے دیکھا کہ فواد میاں گل بی بی کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے تھے اور میم بی بی پاس کھڑی تھیں۔" ملازم نے چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

انسانیہ کرسٹا کی شادی پر دل بھر کر اپنے ارمان نکالنا چاہتی تھی۔

دوسرے روز دوپہر کے کھانے پر اس نے گڑھی درآدم خان کے عمر رسیدہ بزرگوں اور معززین کو مدعو کر کے ویرا اور کرسٹا کا باقاعدہ ان سے تعارف کرایا اور کرسٹا کو مغیرہ گل کی جگہ سمجھ کر اسکی شادی کے جشن کو اس قبیلے کی رسوم و روایات کے مطابق منانے کے لئے ان سے تعاون کی درخواست کی۔

ان بزرگوں نے دیکھا کہ عام یورپین خواتین کے برعکس سنجیدگی، وقار اور شرافت ویرا

کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی اور وہ یورپین لباس کی بجائے پاکستانی کپڑوں میں تہذیب و شائستگی اور خلوص و پاکیزگی کا پیکر دکھائی دیتی تھیں۔

انسانیہ اور فواد کے بیان کے مطابق کرسٹا اور ویرا دونوں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس لئے اب بے جا تعصب اور نفرت کی کوئی وجہ نہ پا کر سب نے خوشی کا اظہار کیا اور ویرا اور کرسٹا دونوں کو مبارک باد دی۔

گڑھی کے سرکردہ لوگوں نے "قبیلے کے مرحوم سردار" کی بیٹی کی شادی کے انتظامات میں نہ صرف بھرپور تعاون کا یقین دلایا بلکہ بہت سے کاموں کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

انسانیہ کے تدبر اور فواد کے مفید مشوروں نے مسئلے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلجھا کر دونوں ماں بیٹی کو اس معاشرے میں ایک باعزت اور ممتاز مقام دلوا دیا تھا۔

فواد نے لاکھ سر مارا کہ شادی کی تقریب سادہ اور پر وقار ہو لیکن کسی نے اسکی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ سبھی من مانی کرنا اور دل کے ارمان نکالنا چاہتے تھے۔ ایک مدت کے انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا۔

سال ہا سال کے بعد اس ویران اور اجڑی پچھڑی حویلی کی قسمت انگڑائی لیکر پھر سے بیدار ہو گئی تھی۔

شادی کا جشن تھا کہ ایک محفل طرب —!

انتظامات میں آسانی کے لئے حویلی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

دلہن کا گھر۔ میکہ۔

اور

دولھا کا گھر۔ سسرال۔!!

دلہن کے گھر میں النسانیہ، ویرا اور گڑھی کے دوسرے سرکردہ افراد انتظامات میں مصروف تھے۔ اس حصے کی تزئین و آرائش اور بناوٹ و سجاوٹ میں پٹھانوں کے اس ممتاز قبیلے کے رسم و رواج اور پرانی روایات کے اثرات غالب تھے۔ برات کے لئے نشستوں کا وہی مخصوص انداز۔

کھانے میں سالم بھنے ہوئے پہاڑی دنبے اور دوسرے مقامی لوازمات۔

گڑھی کی عورتوں کے شادی بیاہ کے مخصوص پشتو لوک گیت۔

خٹک ڈانس..... اور قبیلے کا وہی انداز مہمان نوازی۔!!

قبیلے کی طرف سے دلہن کا عروسی جوڑا بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا آج سے برسوں پہلے مغیرہ گل کو پہنایا گیا تھا۔

دلہن کے لباس، سنگار اور سر سے پاؤں تک کے تمام زیورات میں ایک قبائلی دلہن کے روایتی انداز کی گہری جھلک نظر آتی تھی۔

کرسٹا پردل خان کی بیٹی تھی اور قبیلے کا ہر شخص اسے اپنی بیٹی اور قبیلے کی عزت سمجھ کر شادی کے انتظامات کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف تھا۔

ادھر دولہا کے گھر میں... پنجاب کی کسی خوشحال ماڈرن فیملی کے رسوم و رواج کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔

وہی اندازِ آرائش و زیبائش۔ وہی لباس اور وضع قطع۔!
سہاگ اور سہرے کے وہی معروف پنجابی لوک گیت۔ ریکارڈنگ۔ فلمی گانے۔
مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے شامیانے، صوفے اور میز کرسیاں۔
کھانے کے لئے ایک ایک میز کے ساتھ چار چار ڈائننگ چیئرز، نیپکن، چھری کانٹے اور عمدہ قسم کی کراکری۔!! سروس کے لئے شہر سے منگوائے ہوئے چاق و چوبند بیرے جو کلف شدہ یونیفارم میں ادھر ادھر مصروف نظر آ رہے تھے۔
کھانے میں اعلیٰ قسم کی پاکستانی اور انگلش ڈشز تھیں۔ اور لائٹنگ کا بہترین انتظام تمام درختوں پودوں اور باڑوں کے علاوہ حویلی کی دیواروں اور چھتوں کے ساتھ لٹکتے ہوئے بجلی کے رنگین قمقمے.... نیلی، سبز اور دودھیائی ٹیوبز کی روشنی میں جھلملاتے ہوئے زرتار لباس۔!
سوٹ۔
کرتے پاجامے۔
غرارے اور ساڑھیاں۔!!
بینڈ باجے کی مسحور کن دھنوں کے ساتھ دولہا کے گھر سے نکل کر برات نے گڑھی دراَدم خان کا چکر لگایا اور پھر دلہن کے گھر والے حصے میں پہنچ گئی جہاں گڑھی کے موجودہ سردار اور دوسرے معززین نے اپنے روایتی انداز میں برات کا خیر مقدم کیا۔ چند قدم دور رنگا رنگ کی زرق برق واسکٹوں اور گھیر دار شلواروں اور لمبی گھیر دار قمیصوں والے چست و چالاک نوجوانوں کی ایک ٹولی تلواروں کے رقص میں مشغول تھی۔ بجلی کی طرح کوندنے والی ننگی تلواریں تیز دھوپ میں نگاہوں کو خیرہ کر رہی

تھیں اور نوجوانوں کا رقص عروج پر پہنچ چکا تھا۔
مبارکباد کی دھنوں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے ہجوم میں نکاح پڑھا گیا اور کھانے کے بعد رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔
دعوت ولیمہ دوسرے روز تھی اور دلہن کے تمام میکے والے اسمیں مدعو کئے گئے تھے۔

رات آئی۔ سہاگ رات —!!
مہمانوں کے سارے کاموں سے فراغت پاکر روحی فواد کو ساتھ لے کر آئی اور حجلۂ عروسی کے دروازے تک چھوڑ کر چلی گئی۔
کرسٹا فواد کے لئے نئی تھی نہ فواد کرسٹا کے لئے . . . لیکن جانے کیوں آج سبھی کچھ نیا نیا اور انوکھا سا لگ رہا تھا۔ یہ ایک مخصوص ماحول کا اثر تھا یا اس رات سے وابستہ خاص خیالات و تصورات . . . کہ فواد کرسٹا کے کمرے میں جاتے ہوئے ایک انوکھی قسم کی مسرت کے ساتھ کچھ عجیب سی جھجھک اور شرم بھی محسوس کر رہا تھا۔
اس عمر میں . . . ذہن کی اس پختگی کے ساتھ . . . یہ سب کچھ کتنا عجیب —؟؟
فواد کمرے میں داخل ہوا۔
عروسی کمرے کی شان ہی نرالی تھی۔ روحی اور سیمیں کے ساتھ آصف اور حامد نے مل کر اپنے ذوق جمالیات کا بھرپور اظہار کیا تھا۔
سبھی کچھ بے حد آئیڈیل اور افسانوی معلوم ہوتا تھا اور ایسے میں جگمگ جگمگ کرتے

زرق برق، عروسی لباس اور زیورات سے لدی پھندی کرشٹا جادو کی کہانیوں والی پریوں کی شہزادی سے کم نظر نہ آتی تھی۔

مانگ میں افشاں اور سیندور۔

روشن پیشانی پر ٹیکہ اور جھومر۔

چھلکی والی نتھ۔ بڑے بڑے بندے جن میں لگے ہوئے ڈائمنڈ کا عکس اسکی بلوریں گردن پر دور سے ہی لہراتا ہوا نظر آرہا تھا۔ گردن میں کئی قسم کے چھوٹے بڑے ہار۔ ہاتھوں میں مہندی اور انگوٹھیاں۔

کلائیوں میں ڈھیر ساری چوڑیاں، کڑے اور رسٹ واچ . . . جس کا ڈائل اور چین ہیروں سے دمک رہے تھے۔

انتہائی خوبصورت زیورات . . . چمکتے دمکتے لباس اور بہترین میک اپ نے کرشٹا کو ایک شعلہ جوالہ میں تبدیل کر دیا تھا . . . یا اسکی کے اس نادر و نایاب مجسمے کے روپ میں ڈھال دیا تھا . . . جسے دیکھتے ہی ایک بار تو کیوپڈ دیوتا بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

دیو مالائی کہانیوں کے اس جیتے جاگتے کردار کا جمال اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک دیکھ کر فواد اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پلک جھپکے بغیر . . . دیکھتا چلا گیا۔ ارعب حسن نے چند ثانیے کے لئے اسے واقعی بت بنا دیا تھا . . . . شائد صانع قدرت نے اس مجسمہ رعنائی و محبوبی کو فرصت کے وقت بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا۔

طلائی و نقرئی تاروں اور پھولوں سے آراستہ سیج پر بیٹھی وہ اس دنیائے آب و گل کی مخلوق تو قطعاً معلوم نہ ہوتی تھی۔

فواد اس کے برابر بیٹھ گیا۔ گھونگھٹ ہٹانے کے لئے ابھی اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک ہلکی سی مترنم ہنسی کے ساتھ ایک سرگوشی سی فضا میں ابھری۔

"اوں ہوں ..... ٹھہرو ۔۔!!"

"کیوں ۔۔؟" وہ بے چین ہو اٹھا۔ "آج بھی ۔ یہ فاصلے ۔۔؟؟"

"ہاں ....!"

"مگر کیوں ۔۔؟؟"

"اس لئے کہ روح مادی نہیں روحانی چیز ہے۔ چھونے سے فوراً فضا میں تحلیل ہو جائیگی۔

اور دونوں کی زندگی بخش ہنسی کے درمیان فواد نے اسے بازؤں میں سمیٹ لیا۔

پیپر بیک سیریز کے تاریخی ناول

یہ کتابیں تاریخ کے گم شدہ اوراق کا مجموعہ ہیں۔ ہر ناول کا پلاٹ دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ ماضی کا یہ خزانہ، حال کے کو مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔

النّاصر : رئیس احمد جعفری

اندلس کے قصر الزہرا کی خونچکاں تاریخی داستان
صفحات : ۴۴۸ • قیمت ۱۲/۵۰

حق و باطل : رئیس احمد جعفری

اُن گمنام لیکن سرفروش مسلمانوں کی داستان جو باطل کی قوت سے مرعوب نہ ہوئے۔ صفحات : ۴۰۰ قیمت ۵/۰

شہیدانِ اندلس جبّار توقیر

سرزمینِ اندلس کی ایک تاریخی دستاویز، جس کا ہر لفظ شہیدوں کی خوشبو سے عبارت ہے۔ صفحات : ۲۲۸ قیمت ۵/-

بیرم خاں حسین انور

کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی جشنِ ہمایونی کی تاریخی کہانی
صفحات : ۴۱۲ • قیمت : ۹/-

خواتین کے لکھے ہوئے چند دلچسپ ناول جنھیں مرد بھی پڑھ سکتے ہیں۔

• وہ قربتیں، یہ فاصلے	رفعت زیبا	صفحات ۳۶۸	قیمت ۵/-
• سپنے تیری یادوں کے	شاہدہ سبین	〃 ۴۰۰	〃 ۶/-
• نورنگ	نورُ الصّباح بیگم	〃 ۱۷۶	〃 ۵/-
• قصرِ احمر	نورُ الصباح بیگم	〃 ۳۱۲	〃 ۱۰/-
• آنگن ہوا پردیس	رفعت	〃 ۱۵۲	〃 ۴/۵۰

یہ کتابیں فرصتِ اوّلین میں منگوا لیجیئے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، حیدرآباد، کراچی